بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا مفہوم کیا ہے

مرض، تشخیص اور علاج

(ایک جامع مقالہ جس سے اسلامی حکومت کا تصور اور نقشہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے)

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی!

آج میں جس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں، وہ جس قدر اہم ہے اسی قدر (بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ) نازک بھی ہے۔ اس لئے جو حضرات مطمئن ہیں کہ ہمارا مروجہ اسلام بالکل صحیح ہے اس میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے، نہ اصلاح کی گنجائش۔ کمی صرف اتنی ہے کہ لوگ اس پر عمل نہیں کر رہے۔ تو یہ حضرات میری ان گذارشات کا مطالعہ کرنے کی زحمت نہ فرمائیں اس سے انہیں کسی قسم کا فائدہ پہنچنا تو کجا، الٹی کوفت ہوگی اور میں ایسا قطعاً نہیں چاہتا۔ اس سفر میں میرے ہم رکاب وہی حضرات ہوں جو سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا مروّجہ اسلام وہ دین نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے حضور نبی اکرم ﷺ نے متمکن فرمایا تھا۔ وہ احباب جو اس حقیقت سے متفق ہیں کہ ہماری خرابیوں اور تباہیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے مروّجہ اسلام کو حقیقی دین سمجھ رکھا ہے اور اس کے بعد اس کے متمنی اور متلاشی ہیں کہ وہ حقیقی الدین کیا تھا اور اس کے دوبارہ متمکن ہونے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ وہی میرے ہم عنان ہوسکتے ہیں کہ ؎

زمرغانِ چمن نا آشنایم — بشاخِ آشیاں تنہا سرایم
اگر نازک دلی از من کراں گیر — کہ خونم می تراود از نوایم

(اقبالؒ)

ترجمہ: میں اپنے ہی چمن کے پرندوں سے نا آشنا ہوں۔ اپنے آشیانے کی شاخ پر
تنہا (بیٹھا) گاتا رہتا ہوں۔ اگر آپ نازک دل ہیں تو مجھ سے کنارہ گیر ہو جائیں
کیونکہ میری گیتوں سے خون ٹپکتا ہے۔ (سلیم اختر)

ہمارے اختلافات:

آپ صدرِ اسلام کے مختصر سے عرصہ سے آگے بڑھئے تو آپ کو ہماری صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ ہمارے باہمی انتشار وخلفشار اور افتراق واختلاف کی حدیثِ خونچکاں دکھائی دے گی اس اختلاف وانتشار سے اس وقت میری مراد سیاسی اختلاف نہیں سرِ دست میری مراد مذہبی یا شرعی اختلافات سے ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ بھی ہمارے (صدیوں سے چلے آنے والے) مرّوجہ اسلام کا کرشمہ ہے جس سے ہمارے سیاسی اور شرعی اختلافات الگ الگ شعبوں میں بٹ جاتے ہیں۔ حقیقی اسلام میں اس تقسیم وتفریق کا بھی کوئی تصور نہیں بہرحال، زیرِ نظر مقالہ میں میرا مرکزی موضوع شرعی اختلافات ہی ہیں جن کی وجہ سے ہم (جنگ تو ایک طرف) امن کے زمانہ میں بھی اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کسی نے ان جگر پاش اختلافات کا سبب یا اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی ہے؟

(2) اگر کی ہے تو وہ کسی نتیجہ پر پہنچے یعنی تشخیص کیا تھی؟

(3) اور تشخیص کے بعد کیا اس کا علاج سوچا گیا؟

اس کے بعد، لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ، یا تو کسی نے اس مہلک مرض کی تشخیص کی طرف توجہ نہیں کی۔

(2) اگر تشخیص کی کوشش کی تھی تو یا تو وہ تشخیص غلط تھی یا علاج صحیح نہیں تھا۔

(3) اگر تشخیص اور علاج دونوں صحیح تھے تو وہ علاج کیا ہی نہیں گیا اس لیے کہ نہ صرف یہ کہ اس سے مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا، بلکہ وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ اب اس کی عالمگیریت کی یہ کیفیت ہے کہ ہر جگہ اس کی شکایت ہوتی ہے لیکن علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور جس طرح یہ

معلوم ہوجانے کے بعد کہ مرض لاعلاج ہے مریض پر وہ مایوسی چھا جاتی ہے جسے ''سکون قبل از مرگ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح تشتت وافتراق کے اس مزمن مرض کو اب زندگی کا معمول سمجھ کر گوارا کرلیا گیا ہے۔

میری قریب قریب تمام عمر، قرآنِ کریم پر غور وتدبر اور اُمت کے احوال وکوائف کے مطالعہ میں گزری ہے اور اب میں زندگی کے اس مرحلہ پر پہنچ رہا ہوں جہاں اگلا کنارہ پچھلے کنارے کے مقابلے میں قریب تر ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنی عمر بھر کے غور وتدبر کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور جس کا میں جستہ جستہ اظہار کئے چلا آرہا ہوں اسے جامع طور پر قوم کے سامنے پیش کردوں۔ ہوسکتا ہے کہ دیدہ ورانِ قوم جو اس سے متفق ہوں، اس کے علاج کی طرف توجہ مبذول کریں، یا (کم ازکم) آنے والے ارباب فکر ونظر اس سے استفادہ کرسکیں۔

میں اسے بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ:

(1) میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں میں، (ارشادِ باری تعالیٰ اور اعلانِ حضور نبی اکرم ﷺ کے مطابق) صرف مسلم ہوں قرآنِ کریم کی ابدیت اور نبوتِ حضور نبی اکرم ﷺ کی خاتمیت پر میرا ایمان ہے۔

(2) جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس سے میرا مقصد کسی کے عقیدہ یا مسلک پر تنقید یا تنقیص نہیں۔

(3) نہ ہی اس سے مقصود بحث وتمحیص ہے۔

میں اپنے حاصل تدبر کو نہایت غیر جانبدارانہ انداز سے، خارجی طو رپر (Objectively) پیش کردینا چاہتا ہوں جو اس سے اختلاف کریں، وہ اسے مسترد کردیں مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

میں اتنا اور واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میری تحقیق وتشخیص کا مدار ''دین'' کے حقائق پر ہے اور ہماری (موجودہ) قوم کا تعلق ''مذہب اسلام'' سے ہے اور یہی اصل مشکل ہے۔ دین، اپنے دعاوی کو قرآنی اسناد اور علمی دلائل کی بناء پر پیش کرتا ہے اور فریق مخالف سے بھی دلائل ہی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن مذہب کا تعلق سراسر جذبات سے ہوتا ہے، جسے عام الفاظ میں عقیدت مندی

کہا جاتا ہے اور عقیدت، اصولوں سے نہیں، شخصیتوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ آپ کسی اصول یا نظریہ سے اختلاف کریں گے تو فریق مخالف کے جذبات بہت کم مشتعل ہوں گے لیکن اگر اس گفتگو کے دوران کسی ایسی شخصیت کا ذکر آجائے جس سے اس کی عقیدت وابستہ ہے تو وہ مرنے مارنے پر اتر آئے گا۔ تلاش حقیقت کے راستے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے خاردار وادیوں سے گزرنا ہوگا جس عقیدہ یا مسلک کے سلسلہ میں بات ہوگی وہ کسی نہ کسی شخصیت کی طرف منسوب ہوگا اس لئے ہزار احتیاط کے باوجود، شخصیتوں کا درمیان میں آجانا، ناگزیر ہوگا۔ بقول غالب ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس سلسلہ میں، میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے غیر مذاہب کی کسی ایسی شخصیت کے خلاف جسے وہ واجب الاحترام قرار دیتے ہوں، کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ان لوگوں کے لئے دل آزاری کا باعث ہو چہ جائیکہ میں خود اپنے ہاں کی واجب العزت شخصیتوں کے خلاف کوئی ایسی بات کہوں۔ خیال صرف اتنا رہے کہ جب میں کسی نظریہ یا مسلک پر تنقید کروں تو جن شخصیتوں کی طرف وہ منسوب ہو، اسے ان کی تحقیر پر محمول نہ کیا جائے۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد، اصل موضوع کی طرف آیئے:

1۔ اُمت واحدہ:

آپ کسی مسلمان سے پوچھئے خواہ اس کا تعلق کسی فرقے سے ہو، وہ اس سے متفق ہوگا حتیٰ کہ غیر مسلم مورخین بھی اس کی تصدیق کریں گے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے عہد ہمایوں میں، مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ سب ایک اُمت کے افراد تھے۔ مذہب کا تعلق پوجا پاٹ، بھگتی اور پرستش کے طور طریق یا اخلاقیات کے پند و نصائح سے ہوتا ہے جن پر ہر فرد، اپنے اپنے طور پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ لیکن دین نظام زندگی کا نام ہے جس کے لئے اجتماعیت بنیادی شرط ہے۔ اس لئے قرآن نے ایک اُمت کی تشکیل کی تھی۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

(2:143) ''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنایا تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو، اور تمہارا رسول، تمہارے اعمال کا نگراں ہو۔''

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (3:109)

تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو اور اس حقیقت پر ایمان رکھو کہ معروف و منکر کا تعین خود خدا نے کر دیا ہے۔

2۔ وحدت کیسے پیدا ہوتی ہے:

سوال یہ ہے کہ افراد میں وحدت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے۔ آپ کسی شاہراہ پر دیکھئے اس پر مختلف سواریاں موٹر کاریں، رکشائیں، موٹر سائیکل، عوامی سائیکل وغیرہ مختلف سمتوں میں رواں، دواں، آجا رہے ہوں گے۔ کوئی دائیں کو، کوئی بائیں کو کوئی سامنے کی طرف، کوئی پیچھے کی۔ ان میں کہیں یکسانیت دکھائی نہیں دے گی لیکن جونہی وہ اس گول دائرے پر پہنچیں گے جو مختلف سڑکوں کے جائے اتصال پر بنا ہو، ان میں سے ہر ایک بائیں کی طرف مڑ جائے گا ان سب میں سمت کی وحدت پیدا ہو جائے گی۔

یہ وحدت کس طرح پیدا ہوگئی؟ اس طرح کہ جس مملکت کے یہ باشندے ہیں، اس کا قانون ہے بائیں طرف چلو اس قانون کی پابندی سے ان میں وحدتِ سمت پیدا ہوگئی۔

لہٰذا، افراد میں وحدت پیدا کرنے کے لئے ایسے قانون کی موجودگی ضروری ہے جس کا تمام افراد پر یکساں اطلاق ہو۔

لیکن تنہا قانون کافی نہیں اس کے لئے اس اتھارٹی کی بھی ضرورت ہے جو اسے نافذ کرے اسے ہیئتِ حاکمیہ (یا نظامِ حکومت) کہا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس چوراہے یا گول دائرے کی ہم نے اوپر مثال دی ہے، وہاں ٹریفک کا ایک سپاہی کھڑا ہوتا ہے جو اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ اس قانون کی پابندی ہو رہی ہے۔

اس اتھارٹی کی اہمیت ایک اور مثال سے، زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آئے گی۔ آپ بادشاہی مسجد میں دیکھئے لاکھوں کا مجمع، نماز جمعہ کے لیے بیٹھا ہے۔ جماعت کھڑی ہوجاتی ہے۔ امام کی ایک آواز پر یہ سب کبھی جھک جاتے ہیں۔ کبھی کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کبھی بیٹھ جاتے ہیں آخر سلام پھیر لیتے ہیں۔ لاکھوں کے اجتماع میں اس قسم کی وحدت کی مثال بہت کم ملے گی۔

باجماعت فرض پڑھ لینے کے بعد، صحنِ مسجد پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیے وہی نماز ہے وہی اس کی رکعتیں وہی رکوع وہی سجود، وہی قعود لیکن کوئی کھڑا ہے۔ کوئی رکوع میں، کوئی سجدے، میں کوئی قعدہ میں، کوئی دعا مانگ رہا ہے، کوئی جوتا اٹھائے باہر جارہا ہے۔ مسجد بھی وہی ہے اور نمازی بھی وہی ہیں لیکن ان کی وہ وحدت گم ہوچکی ہے۔ اس کی جگہ اختلاف ہی اختلاف ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ ایک امام کے نہ ہونے سے۔ لہٰذا، اُمت میں وحدت کے لیے ضروری ہے کہ:

(1) ایک قانون ہو جس کی سب اطاعت کریں اور

(2) ایسی اتھارٹی ہو جو اس قانون کو نافذ کرے اور اس کی پابندی کرائے۔

3۔ عدالت:

آپ کسی کچہری میں جائیں وہاں سینکڑوں افراد مصروفِ تگ وتاز نظر آئیں گے یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ ہیں جن میں کسی معاملہ میں اختلاف ہوگیا اور انہوں نے اس کے تصفیہ کے لیے عدالت کی طرف رجوع کیا ہے۔ عدالت ان میں قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی اور ان کا اختلاف مٹ جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جس قانون کے مطابق عدالت نے فیصلہ دینا ہے، اس سے یہ لوگ (فریقین) واقف ہیں۔ اگر یہ خود واقف نہیں تو وکلا موجود ہیں جنہیں ان قوانین کا علم ہے، لیکن یہ وکلا ان کے تنازعہ (مقدمہ) کا فیصلہ نہیں کرسکتے وہ ایسا کرنے کے مجاز نہیں، ان کا فیصلہ قانون کی نظروں میں قابل قبول نہیں ہوگا۔ خواہ وہی فیصلہ کیوں نہ ہو جو عدالت دے گی اس سے واضح ہے کہ اختلافات مٹانے اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تین عناصر لاینفک ہیں، یعنی (1) قانون، (2) قوت نافذہ یا مرکزی اتھارٹی اور (3) عدالت۔

4۔قانون شکنی اور بغاوت:

اگر مملکت کا کوئی فرد، کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو حکومت کی طرف سے اس کا مواخذہ کیا جاتا ہے۔ اسے جرم اور اس کی سزا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پاکستان میں رہتے ہوئے، بھارت کے قانون کو اتھارٹی تسلیم کرتا ہے تو اسے، حکومت پاکستان کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔ بغاوت کے معنی یہ ہیں کہ وہ مملکت پاکستان کے ہم دوش ایک اور مملکت قائم کرتا ہے اسے کوئی مملکت بھی برداشت نہیں کرسکتی نہ ہی وہ اسے برداشت کرے گی کہ کوئی فرد (یا جماعت) اس مملکت کے اندر رہتے ہوئے، قانون سازی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے اسے بھی اس مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔

ہم نے وحدت اُمت اور دین کے نظام کو سمجھانے کے لیے دورِ حاضر کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس لئے کہ جب اسلام کے صدرِ اوّل میں، دین کا نظام قائم ہوا تھا تو اس قسم کی اصطلاحات رائج نہیں تھیں، اور جن الفاظ میں اس نے اپنے نظام کو سمجھایا ہے ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک انہیں دورِ حاضرہ کی اصطلاحات کے تقابل یا تناظر میں سامنے نہ لایا جائے مثلاً قرآنِ کریم میں، نہ کہیں قانون کا لفظ آیا ہے نہ نظام کا نہ مملکت کا نہ عدالت کا نہ مرکزی اتھارٹی کا، نہ ہیئت حاکمہ کا۔ ان کے لیے اس کے اپنے الفاظ ہیں، اور جب تک ان الفاظ کا مفہوم، مرّ وجہ نظامِ سیاست واسلوب حکومت کی روشنی میں سامنے نہ آئے، دین کے نظامِ حیات کا تصور سامنے نہیں آسکتا، بالخصوص جب وہ نظام دینا میں کہیں موجود نہیں، اور اس کی جگہ مذہب (یعنی مرّ وجہ اسلام) نے لے رکھی ہے جس کا اس نظام سے کوئی تعلق نہیں۔

الٰہ، عبادت، کلمات:

قرآنِ کریم میں حاکم یا صاحبِ اقتدار کے لئے الٰہ کا لفظ آیا ہے۔ محکومیت کے لئے عبادت یا عبدیت کا اور قوانین کے لئے کلمات اللہ یا حدود اللہ کا۔ اس کے نظام کی امتیازی خصوصیت یا انفرادیت اس میں ہے کہ اس میں حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خواہ اس کی کچھ بھی پوزیشن کیوں نہ ہو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَہُ اللّٰہُ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (3:79)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اس کی حیثیت مقننہ کی ہو اور خواہ انتظامیہ کی، (اسے کتاب حاصل ہو، خواہ حکم) حتیٰ کہ نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔

حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ (12:40) ''اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کی جائے۔'' اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ ؕ (12:40) ''یہی محکم دین (نظام) ہے جسے خدا نے عطا فرمایا ہے۔'' ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (12:40)

شرک:

ہم نے پہلے بتایا ہے کہ کسی مملکت میں رہتے ہوئے کسی دوسری مملکت کے قانون کو اتھارٹی تسلیم کرنا، بغاوت کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے لئے شرک کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ جب اس نے کہا کہ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ (6:57) تو اس کے ساتھ ہی واضح کر دیا کہ وَّلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ۙ (18:26) ''وہ اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔'' (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) وہ قانون سازی یا حکومت کا حق کسی انسان کو نہیں دیتا حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں اس لئے اس نے خدا کی محکومیت اختیار کرنے والوں سے کہہ دیا کہ وَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۟ۙ (28:87) ''دیکھنا! تم کہیں شرک نہ کرنے لگ جانا۔'' وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۘ ''خدا کے ساتھ کسی اور کو صاحب اقتدار تسلیم نہ کر لینا۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ (28:88) ''حکومت اسی کے لئے مختص اور مخصوص ہے۔'' خدا کا عبد (محکوم) وہی ہو سکتا ہے جو وَّلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ۧ (18:110) ''اپنے رب کی محکومیت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

ضابطہ قوانین:

قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا خدا کی حکومت، کسی ڈکٹیٹر کی حکومت

نہیں کہ وہ جو جی چاہے حکم دے دے، اس کی اطاعت لازم آئے گی۔ اس نے کہا کہ حکمرانی قانون کی ہوگی، اور خدا نے اپنی حکمرانی کے لئے ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے جسے قرآنِ مجید کہا جاتا ہے۔ یہ ضابطہ قوانین، رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملا تھا، لیکن اس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ ان قوانین کا اطلاق خود رسول اللہ ﷺ پر بھی اسی طرح ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں پر، واضح رہے کہ کسی مملکت کے قوانین کا اطلاق انہی لوگوں پر ہوسکتا ہے جو اس مملکت کے حقِ اقتدار کو تسلیم کریں۔ مملکت خداوندی کے حقِ اقتدار کو تسلیم کرنے کو ''خدا پر ایمان لانا'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ خدا پر ایمان لانا خود رسول کے لیے بھی ضروری تھا۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط (2:285) ''جو کچھ خدا نے رسول پر نازل کیا، خود رسول بھی اس پر اسی طرح ایمان لاتا ہے جس طرح دوسرے مومن۔۔۔''

2۔ خود رسول بھی اسی ضابطہ قوانین کا اتباع کرتے تھے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ط (6:50) ''ان سے کہو کہ میں خود اسی ضابطہ قوانین کا اتباع کرتا ہوں جسے خدا نے میری طرف وحی کیا ہے۔'' (7:203، 33:2) ''دوسری جگہ ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ج اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (10:15) ''میں اسی کا اتباع کرتا ہوں جسے خدا نے میری طرف نازل کیا ہے اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں ہوسکتا۔''

اس ضابطہ قوانین کی خصوصیات اس قدر ہیں کہ ان صفحات میں ان کا احاطہ ممکن نہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(ا) خدا نے جو احکام بذریعہ وحی دینے تھے وہ سب اسی کتاب (قرآن) کے اندر منضبط کر دیئے تاکہ لوگوں کو اس کی تلاش نہ کرنی پڑے کہ فلاں قانون کس جگہ ملے گا۔ تمام احکامِ خداوندی اس ایک کتاب کے اندر مذکور ہیں۔ یہی حضور ﷺ کے ہم عصروں کے لئے ضابطہ، ہدایت تھی اور یہی آپ ﷺ کے بعد آنے والے (قیامت تک کے) انسانوں کے لئے ضابطہ قوانین ہے۔ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط (6:19)

(ب) چونکہ یہ کتاب انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی (خدا کی نازل فرمودہ تھی) اس لئے ساری دنیا کو چیلنج دیا گیا کہ اس کی مثل قوانین مرتب کر کے دکھاؤ۔ وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿2:23﴾ ''اگر تمہیں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہو تو اس کی ایک سورت کی مثل مرتب کر کے دکھاؤ اور اپنے ساتھ اپنے ہمنوا ساتھیوں کو بھی شریک کر لو اس سے واضح ہو جائے گا کہ تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو یا جھوٹے۔

(ج) یہ کتاب اپنی ہر بات کو اس طرح واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ اس کے مطالب کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کا ابہام رہتا ہے نہ الجھاؤ وَنَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ (16:89) ''اور ہم نے تیری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جو ہر بات کو کھول کھول کر بیان کرتی ہے۔

(د) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ وَلَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا ﴿4:82﴾ ''کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سی اختلافی باتیں پاتے۔

(س) خدا نے جس قدر احکام و قوانین انسانوں کو دینے تھے، وہ سب اس میں آ گئے اس لئے یہ ہر اعتبار سے مکمل ہے اور جو قوانین اس میں دیئے گئے ہیں وہ ایسے محکم ہیں کہ ان میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں نہ ہی کسی کو اس کا حق حاصل ہے کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے۔

وَتَمَّتۡ کَلِمَۃُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ (6:116، 18:27) تیرے رب کے جملہ قوانین اس کتاب میں صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے انہیں تبدیل کرنے والا کوئی نہیں۔

حتیٰ کہ رسول کو بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ ۚ (10:15) ''اے رسول! ان سے کہہ دو کہ مجھے اس کا اختیار ہی نہیں

کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر سکوں۔''

(ش) اس کتاب کو ہر اعتبار سے مکمل اور نا قابل تغیر وتبدل قرار دینے کے بعد اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝ (15:9) ہم ہی نے اسے نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

(ص) اس کے بعد نوع انسان سے کہہ دیا کہ یہ کتاب تمہاری راہنمائی کے لئے کافی ہے۔ اَوَ لَمۡ یَکۡفِہِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ ؕ (29:51) ''اے رسول! ان لوگوں سے پوچھو کہ کیا یہ ضابطہ قوانین جسے خدا نے تیری طرف نازل کیا ہے، اور جسے تو نے ان کے سامنے پیش کر دیا ہے (چھپا کر نہیں رکھا) کیا یہ ان کی راہنمائی کے لئے کافی نہیں؟''

حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ (12:40) اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ ؕ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (12:40) یہی محکم نظامِ زندگی ہے۔ خدا اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَّلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ۝ (18:26)۔

حکومت:

ضابطہ قوانین کیسا ہی منفرد اور مکمل کیوں نہ ہو، محض پند ونصائح کی کتاب ہے اگر اس کے ساتھ ''قوت نافذہ'' یا حکومت نہ ہو۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ (24:55)

ہم نے ان لوگوں سے، جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (33:27) یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے سابقہ اقوام کو بھی اس

قسم کی حکومت عطا کی تھی۔ اس حکومت کا مقصد یہ ہوگا کہ اس دین (نظام زندگی) کو استحکام حاصل ہو جائے جسے ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف امن سے بدل جائے گا تا کہ وہ نہایت اطمینان اور سکون سے صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کر سکیں اور ان پر کسی کا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کی بھی اطاعت کریں اور اس کے ساتھ کسی اور قانون کی بھی، اور اس طرح شرک کے مرتکب ہو جائیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں کیسے عظیم حقائق ایک ہی آیت میں سمو کر رکھ دیئے ہیں یعنی

(i) یہ حکومت بزور شمشیر حاصل نہیں کی جائے گی یہ ''ایمان واعمال صالحہ'' کا فطری نتیجہ ہوگی۔

(ii) دیکھنے کے لئے کہ ہمارا ایمان اور اعمال قرآنی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے نتیجہ میں ہمیں اس قسم کی حکومت ملتی ہے یا نہیں۔

(iii) اس حکومت کا مقصد، کمزور انسانوں پر ظلم واستبداد اور سلب ونہب نہیں ہوگا اس کا مقصد دین کا تمکن ہوگا۔

(iv) دین کا تمکن، اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔

(v) اس قسم کی حکومت کے بغیر، احکامِ خداوندی کو نافذ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ صدرِ اوّل کی جماعت مومنین کے متعلق فرمایا کہ: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ (22:41) ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض ملک میں حکومت۔۔۔ حاصل ہوگی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کریں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں گے اور ان کے تمام معاملات آخر الامر قوانین خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔

حضور ﷺ کی حکومت:

یہ ضابطہ حیات اور حکومت عطا ہونے کے بعد حضور ﷺ سے فرمایا کہ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (5:48) ''ان میں ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو اور ان کے معاملات

کا فیصلہ اسی کے مطابق کرو۔'' آپؐ نے ان لوگوں سے واضح طور پر کہہ دیا کہ اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا وَّہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (6:115) ''اے میری دعوت کے مخالفو! کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسا ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے جو بڑا مفصل ہے۔''

قرآنِ کریم میں '' یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ '' کے جس قدر احکام آئے ہیں وہ اسی حکومت کے فرائض ہیں۔

عدالت:

حکومت کا زیادہ تر تعلق انتظامی معاملات سے ہوتا ہے جہاں تک افراد کے اختلافات کا تعلق ہے ان کا فیصلہ عدالت کے ذریعے ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کا یہی منصب تھا جس کے متعلق فرمایا کہ: فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۶۵﴾ (4:65)

خدا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنائیں۔ اور جو فیصلہ تم صادر کرو اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کریں کہ اپنے دل کہ گہرائیوں میں بھی ان کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں۔

اس عدالت کی طرف رجوع کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ان کے اختلافات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہو جائے۔ اِخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡہِ مِنۡ شَیۡءٍ فَحُکۡمُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ (42:10) ''جن معاملات میں بھی اختلاف ہو، ان کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے لیا کرو۔'' ظاہر ہے کہ جب فیصلہ اس کتاب کی رو سے ہونا تھا جس کی صداقت پر ان کا ایمان تھا، اور اس جج (رسول ﷺ) کی وساطت سے، جس کی امانت پر بھی ان کا ایمان تھا۔ تو پھر اس فیصلہ کے خلاف دل میں گرانی کس طرح پیدا ہو سکتی تھی؟ قرآن تو آیا ہی اختلافات مٹانے کے لئے تھا (16:64)۔

کفر اور اسلام میں خط امتیاز:

ان تصریحات کے بعد واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ

هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (5:44) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہتے ہیں۔

یہ تھا وہ نظام جس نے اُمت میں وحدت پیدا کر دی تھی۔ ایک ضابطہ قوانین جس کے مطابق اُمت کے تمام انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس کی تاکید اس اُمت کو ان الفاظ میں کر دی گئی تھی کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝ (3:103)

اعتصام بحبل اللہ:

تم سب کے سب، بلا استثناء، اجتماعی طور پر کتاب اللہ کے ساتھ، محکم طور پر وابستہ رہو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا ہونے دو۔ تم ذرا اپنی پچھلی حالت پر غور کرو جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور تم میں باہمی عدوات تھی خدا نے اس حالت میں تمہیں ایسا ضابطہ زندگی اور نظامِ حیات عطا کیا جس سے تم میں (ظاہری اتحاد ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے تمہارا اس طرح ایک اُمت بن جانا، خدا کا کتنا بڑا انعام تھا۔ تم اس سے پہلے ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس نظامِ خداوندی نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ اللہ اس طرح اپنے قوانین وضوابط اور ان کے نتائج وثمرات واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔ اس آیہ جلیلہ سے تین اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

(1) اعتصام (وابستگی) صرف حبل اللہ (کتاب اللہ) کی مطلوب ہے۔ کسی اور چیز کی نہیں۔

(2) یہ وابستگی (اطاعت) انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی (جمیعا) ہے۔ اسی ضابطہ قوانین کی اطاعت میں اُمت واحدہ کی تشکیل، استحکام اور بقا کا راز مضمر ہے۔

(3) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا تو مثبت حکم ہے اس کے برعکس تفرقہ سے منع کیا گیا ہے۔ تفرقہ کا

مطلب کیا ہے، یہ سمجھنے کی بات ہے۔ اس کے لئے ٹریفک کے چوراہے کی مثال سامنے لائیے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مملکت کے قانون کی اطاعت کرنے والی جماعت بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ جو لوگ (اس قانون کے برعکس) کسی اور قانون کی اطاعت کرنا چاہتے تھے، وہ ان سے الگ ہو کر، دائیں جانب مڑ گئے اسے (یعنی الگ ہوجانے کو) تفرقہ کہتے ہیں، اور اس طرح الگ ہوجانے والوں کو فرقہ۔

شرک کے عنوان کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے اس میں بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کے سوا کسی اور قانون کی اطاعت کرنا، شرک ہے یہ اطاعت کسی اور مملکت کے قانون کی ہو، یا خود اپنا فیصلہ، ان میں کوئی فرق نہیں ان میں سے کسی کی اطاعت بھی ہو، وہ شرک کے زمرہ میں آجاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ (45:23) ''تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا حکمران بنالیا قانونِ خداوندی کے بجائے، اپنے فیصلوں کا اتباع کرنے لگ گیا۔'' یہ بھی شرک ہے کیونکہ اس سے بھی وہ جماعت (اُمت) سے الگ ہوجاتا ہے۔ اس کو تفرقہ کہتے ہیں اور قرآن کریم نے بہ نصِ صریح تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے فرمایا: وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝ مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ۝ (30:31-32) ''اے جماعت مومنین! دیکھنا تم مشرکین میں سے نہ ہوجانا، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کردیا اور ایک الگ فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔''

اس فرقہ بندی سے کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ ہر فرقہ اس خودفریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ میرا فرقہ حق پر ہے اور باقی سب باطل پر، (حالانکہ) جب اُمت فرقوں میں بٹ جائے تو کوئی فرقہ بھی حق پر نہیں رہتا۔ حق پرستی تو مشروط ہی اُمت کی وحدت سے ہے۔

اس کے بعد ایک اور حقیقت پر بھی غور کیجئے جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، شرک کے معنی اپنی مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغاوت کرنے والوں کا اپنی ملکت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا اس لئے فرمایا اِنَّ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِىۡ

شَیۡءٍ ؕ (6:160) ''جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں وہ اس مملکت کے باغی ہیں۔''

حقیقی شرک تفرقہ ہے:

ہمارے ہاں شرک، صرف بت پرستی کو کہا جاتا ہے۔ (میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس کا یہ مفہوم کیوں وضع کیا گیا؟) لیکن قرآنِ کریم نے ایک مقام پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ بت پرستی بے شک باطل ہے لیکن اس کی بنیاد جہالت ہے۔ حقیقی شرک تفرقہ ہے۔ داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے باہر تشریف لے گئے اور قوم کی نگہبانی حضرت ہارونؑ کے سپرد ہوئی، تو قوم نے گئوسالہ پرستی اختیار کر لی۔ حضرت موسیٰؑ واپس تشریف لائے تو سخت برافروختہ ہوئے اور حضرت ہارونؑ سے بڑی سختی اور درشتی کے ساتھ پوچھا کہ یہ کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا اور تم اطمینان سے بیٹھے رہے۔ تم نے انہیں اس سے روکا کیوں نہ؟ حضرت ہارونؑ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں انہیں اس سے منع کرتا تو قوم میں پھوٹ پڑ جاتی اور تم مجھ سے ناراض ہو جاتے کہ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ (20:94) ''تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا۔'' میں نے ان کی بت پرستی کو تو کچھ وقت کے لیے گوارا کر لیا لیکن ان میں تفرقہ پیدا نہیں ہونے دیا اس جواب سے حضرت موسیٰؑ مطمئن ہو گئے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفرقہ کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔ یہ بت پرستی کے شرک کے مقابلہ میں، کہیں زیادہ خطرناک شرک ہے۔

اختلاف:

تفرقہ (فرقہ بندی) سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے اسے قرآن نے کفر قرار دیا ہے اور روسیاہی کا موجب بنایا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (3:104)

اے جماعت مومنین! دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو خدا کی طرف سے واضح

راہنمائی آجانے کے بعد، فرقوں میں بٹ گئے اور آپس میں اختلاف پیدا کرلیا اس کا نتیجہ سخت تباہی کا عذاب ہوگا۔

اگلی آیت میں ہے کہ یہ روش ان کی روسیاہی کا موجب ہوگی۔

(ضمناً) مشاورت میں مختلف آراء اور مختلف خیالات سامنے آئیں گے۔ یہ وہ اختلاف نہیں جس سے منع کیا گیا ہے۔ اختلاف یہ ہے کہ معاملہ زیر بحث کے متعلق فیصلہ ہوجانے کے بعد، اس کی مخالفت کر کے ایک الگ ٹولہ بنالیا جائے جس اختلاف کا نتیجہ، تفرقہ (فرقہ پرستی) ہو، وہ اختلاف کفر ہے اور اس کا نتیجہ (فرقہ بندی) شرک۔

''بات واضح ہے کہ جب بھی قرآنِ کریم کے سوا کسی اور قانون، حکم یا فیصلہ کی اطاعت کی جائے گی تو اس سے تفرقہ پیدا ہوگا اور جب اُمت میں تفرقہ پیدا ہوجائے وہ فرقوں میں بٹ جائے تو پھر اسلام باقی نہیں رہتا! اسلام اور اُمت کی وحدت لازم وملزوم ہیں اور اُمت کی وحدت نتیجہ ہوتی ہے خالص کتاب اللہ کی اطاعت کا۔''

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

کہا یہ جائے گا (اور جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا یہ کہا جاتا ہے) کہ قرآنِ کریم نے اللہ کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اگر دین نام ہے خالص اللہ (یعنی کتاب اللہ) کی اطاعت کا، تو رسول ﷺ کی اطاعت کے حکم خداوندی کی تعمیل کس طرح کی جائے گی؟ اس اطاعت کا ذریعہ تو قرآن سے خارج ہی ہوگا۔

یہی ''دو اطاعتوں'' کا تصور یا عقیدہ سرچشمہ ہے اس تمام افتراق واختلاف، اور تشتت اور انتشار کا جس میں اُمت ہزار برس سے مبتلا چلی آرہی ہے۔ یہی ساری بحث کا نقطہ ماسکہ ہے اور یہی میرے اس مقالہ کا موضوع۔ میں نے کافی غور وخوض کے بعد مناسب یہ سمجھا ہے کہ قرآن کی

اس اصطلاح کا مفہوم تو یہاں بیان کر دیا جائے اور اس مفہوم کی وضاحت دلائل اور قرآنی اسناد، آخر میں جا کر سامنے لائی جائیں، کیونکہ اس امر کا فیصلہ اسی وضاحت اور سند کے بعد ہوگا کہ ہمارا مروجہ اسلام، حقیقی اسلام ہے جس میں کسی اصلاح اور تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں یا حقیقی اسلام کچھ اور ہے۔

منفرد نظامِ حکومت:

نزولِ قرآن کے زمانے میں عربوں کے ہاں منظّم حکومت کا وجود تو ایک طرف، تصور تک بھی نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے منظّم حکومت (یا نظامِ حکمرانی) کا تصور ہی نہیں دیا بلکہ اسے دین کی غایت یا منتہیٰ قرار دیا لیکن اس نے جس قسم کی حکومت کا تصور دیا وہ دنیا جہاں سے نرالہ تھا۔ انبیاء سابقہ کے استخلاف فی الارض کا نقشہ تو اسی قسم کا ہوگا لیکن زمانہ نزولِ قرآن میں اس کے آثار تک مٹ چکے تھے۔ جو حکومتیں اس وقت دنیا میں قائم تھیں، قرآن کا پیش کردہ تصور ان سے یکسر مختلف تھا۔ یہ وجہ ہے جو قرآن نے ان لوگوں کے ہاں کی سیاسی یا حکومتی اصطلاحات کو استعمال نہیں کیا۔ ان لوگوں کے تصورِ حکومت میں، حکمرانی کسی نہ کسی شکل میں انسانوں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ قرآن کا تصور یہ تھا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ جس کی تعمیل کا ذریعہ اس کی کتاب میں مندرج قوانین و احکام ہیں۔ لہٰذا اطاعت صرف خدا (بالفاظ دیگر خدا کی کتاب) کی جائز ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ کے یہی معنی ہیں۔

لیکن کتاب یا اس میں لکھے ہوئے احکام و قوانین تو ساکت و صامت (خاموش) ہوتے ہیں۔ ان کی اطاعت کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اگر اسلام بھی ایک مذہب ہوتا تو ہر شخص ان احکام کی اطاعت اپنے اپنے طور پر کر لیتا لیکن یہ تو الدین (یعنی ایک اجتماعی نظام) ہے جس میں ان قوانین کی اطاعت اجتماعی طور پر ہوگی اور یہ چیز ایک منظّم حکومت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ تنہا کتابوں سے یہ ممکن نہیں۔

قرآن نے کہا کہ اس کے لئے بے شک ایک منظّم حکومت کی ضرورت ہے لیکن اس حکومت میں کسی انسان کو قانون سازی کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس حکومت کا فریضہ، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا ہوگا اس کے لئے کس کس قسم کے طریق اور اسلوب اختیار کئے جائیں گے

اسے وہ نظامِ اُمت کے باہمی مشورہ سے خود طے کرے گا۔

اس انداز کی حکومت پہلے پہل، حضور نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمائی جس کی مرکزی اتھارٹی وہ خود تھے۔ اس حکومت کا فریضہ، احکام وقوانین خداوندی کا نفاذ تھا اور بس۔ اس ضمن میں جو آیات پہلے گذر چکی ہیں، انہیں ایک بار پھر سامنے لایئے ان سے اس نظامِ حکومت کے بنیادی خط وخال واضح ہوجائیں گے یعنی۔

1۔ اس میں کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں تھا حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں، کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے۔

2۔ حکومت کا فریضہ، احکام وقوانینِ خداوندی پر عمل کرانا تھا۔

3۔ حکومت کا سربراہ، سب سے پہلے ان احکام وقوانین کی اطاعت خود کرتا تھا۔

4۔ قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کے تغیّر وتبدل، حک واضافہ یا ترمیم وتنسیخ کا حق کسی کو حاصل نہیں تھا۔

5۔ افرادِ مملکت، ان قوانین کی اطاعت اپنے اپنے طور پر نہیں کرتے تھے بلکہ حکومت کے نافذ کردہ طریق کے مطابق کرتے تھے نظر بظاہر یہ اطاعت نظامِ حکومت کی تھی لیکن درحقیقت یہ اطاعت خدا کی اطاعت تھی۔

اس قسم کے نظامِ حکومت کے لئے دنیا میں کوئی اصطلاح موجود نہیں تھی۔ قرآن نے اس کے لئے اپنی اصطلاح وضع کی اور وہ اصطلاح تھی ''اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ'' کی یعنی خدا کی اطاعت، اس نظام کی رو سے جس کا سرابرہ رسول ﷺ ہے۔ ذیل کی آیت میں اسی نظامِ حکومت کا نقشہ ان الفاظ میں مرتب کردیا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ۝

(4:59)

اے جماعت مومنین! تم اس نظامِ حکومت کی پوری پوری اطاعت کرو جسے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرانے کے لیے اس کے رسول نے قائم کیا ہے۔ اس کا تنظیمی نقشہ یہ ہے کہ اس کی ایک مرکزی حکومت ہے اور اس کے ماتحت، افسران مجاز، ان افسروں کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ایسا ہو کہ تم میں اوران ماتحت افسروں میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس کے لئے مرکزی حکومت کی طرف رجوع کرو۔ یہ شہادت ہوگی اس امر کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطہ قوانین او رمکافاتِ عمل پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ اور مآل کار معاشرہ کا توازن برقرار رکھنے کا موجب ہوگی۔

اس میں ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' سے مراد اس نظام کی مرکزی حکومت ہے اور اولی الامر سے مراد، افسرانِ ماتحت۔ ان افسروں کے فیصلہ کے خلاف، مرکزی حکومت میں اپیل دائر کی جاسکے گی لیکن اس حکومت کا فیصلہ حرفِ آخر ہوگا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس مفہوم کی قرآنی اسناد اور تائیدات، آگے چل کر پیش کی جائیں گی یہاں صرف اتنی وضاحت کافی ہوگی کہ اگر ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' سے مراد، رسول اللہ ﷺ کی ذات کی اطاعت لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نظام کو حضور ﷺ کی ارضی حیات تک ہی رہنا تھا اس کے بعد ختم ہو جانا تھا۔ لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں اللہ تعالیٰ کا دعویٰ ہے کہ اسلام، تمام نوع انسان کے لئے آخری اور مکمل دین ہے، اس لئے اسے حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی رہنا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن نے خود ہی (یہ کہہ کر) وضاحت کر دی کہ:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

(3:144)

محمد ﷺ بجز! این نیست کہ اللہ کا رسول ﷺ ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی رسولؑ آئے اور (اپنی مدتِ حیات پوری کرنے کے بعد) دنیا سے چلے گئے سو اگر یہ رسول ﷺ بھی کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے، تو کیا تم (یہ سمجھ کر دین تو حضور ﷺ کی زندگی تک محدود تھا۔ جب آپ ﷺ دنیا میں نہ رہے تو دین کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا) اپنی زمانہ قبل از اسلام کی روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ جو ایسا کرے گا وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) اللہ کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا (ان کے برعکس) جو لوگ اس نظام پر قائم رہیں گے انہیں اس کا اجر ملتا رہے گا۔

حضور ﷺ کے بعد:

یعنی یہ نظام، حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی اسی طرح قائم رہے گا اور آگے چلے گا۔ اور'' اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ '' کی عملی شکل اس نظام کی اطاعت ہوگی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے، حضور ﷺ کی وفات پر، جب جماعتِ مومنین میں کہرام مچ رہا تھا، ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

ایھا الناس من کان یعبد محمد فانہ قدمات ومن کان یعبد اللہ فانہ حیی لایموت۔۔۔

اے لوگو! جو شخص محمد ﷺ کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھا وہ جان لے کہ اس کا حاکم وفات پا گیا ہے لیکن جو اللہ کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھا تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ زندہ ہے۔ اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اللہ کے زندہ رہنے سے مراد یہ تھی کہ اس کی کتاب محفوظ ہے جو ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حکومت رہے گی۔ اس کی عملی شکل کے متعلق خود رسول اللہؐ نے فرمادیا تھا کہ:

علیکم بسنتی وسنتہ الخلفاء الراشدین المھدیین۔۔۔

(مشکوٰۃ باب اعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریق کا اتباع لازم ہے اور (میرے بعد) میرے خلفاء
(جانشینوں) کے طریق کا جو خدا کی راہنمائی میں خود بھی چلتے رہیں گے
اور تمہیں بھی چلائیں گے۔

حضور ﷺ کے بعد ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا عملی مفہوم اسی نظام کی اطاعت تھی جو حضور ﷺ کے سچے جانشینوں کے ہاتھوں قائم رہا اسی کو دیگر متعدد روایات میں ''تمسک بالجماعت اور اطاعتِ امیر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد:

حضور ﷺ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہ نظامِ حکومت قائم رہا اور ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کے فریضہ کی ادائیگی میں نہ کوئی عملی دشواری پیش آئی، اور نہ ہی اس کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں کوئی ذہنی الجھاؤ پیدا ہوا۔

اس کے بعد، اس نظام کی جگہ ملوکیت آ گئی جس میں ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی جگہ انسانوں کی حکومت نے لے لی اس سے نہ وہ نظام باقی رہا نہ اس کی مرکزیت نہ جماعت رہی، نہ اس کی وحدت دین، سیاست سے الگ ہو کر مذہب بن گیا، اور اس تبدیلی کے ساتھ ہی قرآن کی اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ اب الٰہ کے معنی ہو گئے۔ ''وہ جس کی پرستش کی جائے'' عبادت کے معنی ہو گئے ''پرستش پوجا'' توحید کے معنی ہوئے یہ ماننا کہ ''خدا ایک ہے'' اور شرک کا مفہوم ہو گیا ''بت پرستی۔'' نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مذہبی شعائر قرار پا گئے جنہیں انفرادی طور پر اور ہر طرح کی حکومت کے تابع ادا کیا جا سکتا ہے۔ خدا کی حکمرانی سے مراد ہو گیا، خارجی کائنات میں اس کی حکومت۔

لیکن یہاں پہنچ کر انہیں ایک دقت پیش آئی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ تو احکامِ خداوندی تھے۔ ان کی ادائیگی سے ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ'' کا فریضہ ادا ہو گیا لیکن ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا فریضہ کس طرح ادا ہو؟ اس کا ذریعہ کیا ہو؟ اس کے متعلق سوچا یہ گیا کہ یہ اطاعت نبی اکرم ﷺ کے ارشادات کی اطاعت کی رو سے ہو سکے گی لیکن اس میں پھر ایک اور دقت پیش آئی قرآنِ

مجید تو مدون اور مرتب شکل میں موجود تھا لیکن ارشادات نبوی ﷺ کا کوئی ایسا مجموعہ موجود نہیں تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کرایا تھا۔ یہی نہیں کہ آپ ﷺ نے خود ایسا مجموعہ مرتب نہیں کرایا تھا بلکہ صحابہؓ کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ حضور ﷺ کے اقوال کو لکھیں۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔۔۔

مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو جس نے قرآن کے سوا کچھ اور لکھ لیا ہو، وہ اسے مٹا دے۔ مسند امام احمدؒ میں ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا:

ہم لوگ جو رسول اللہ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے ایک دن رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیتے ہو ہم نے عرض کیا کہ حضور ﷺ سے جو کچھ ہم لوگ سنتے ہیں اسے لکھ لیا کرتے ہیں تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ پھر فرمایا، خالص رکھو اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو (صحابہؓ کہتے ہیں کہ) ہم نے جو کچھ لکھا تھا اسے ایک میدان میں اکٹھا کیا اور جلا دیا۔

(بحوالہ تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، ص:249)

چنانچہ حضور ﷺ نے، حجۃ الوداع کے خطبہ میں، لاکھوں کے اجتماع میں اعلان فرمایا کہ:

وانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ۔۔۔

(صحاح بحوالہ سیرۃ النبی علامہ شبلیؒ، جلد دوم، ص:156)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد، حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے اُمت کے لئے کیا چھوڑا ہے۔ انہوں

نے جواب دیا مابین الدفتین یعنی مجلد قرآن کریم یہی حضرت محمد بن حنفیہؒ نے بھی کہا۔

(صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، جلد سوم، ص:143)

حضور ﷺ کے بعد، صحابہؓ کے دور میں بھی ایسا ہی ہوا یعنی انہوں نے بھی، نہ یہ کہ احادیث نبوی ﷺ کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کرایا جس کے پاس کوئی تحریری نوشتہ موجود تھا اس نے اسے جلا دیا یہ حقیقت ایسی مسلمہ ہے کہ اس کی تائید میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں تفصیل اس اجمال کی، ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ نہایت اہم کتاب ''مقامِ حدیث'' میں ملے گی نیز میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب میں اور اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس قدر مجموعہ ہائے احادیث موجود ہیں (جو تیسری صدی میں مرتب ہوئے تھے) ان میں، ان سے پہلے کی کسی کتاب کا نہ حوالہ ملتا ہے نہ اقتباس۔

قوانین کی جزئیات:

یہ جو واقعہ ہے کہ نہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کیا، نہ مرتب ہونے دیا نہ ہی خلفائے راشدین نے ایسا کیا، تو ایسا سہواً نہیں کیا گیا دانستہ کیا گیا یہ خدا کے پروگرام کے مطابق تھا۔ قرآنِ کریم مکمل ضابطۂ حیات ہے لیکن اس کی صورت ایسی ہے کہ اس میں (بجز چند احکام) اقدار و اصول دیئے گئے ہیں ان اصولوں کی جزئیات خود ہی متعین نہیں کیں یہ اس لئے کہ دین کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہنے تھے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق اور ان قوانین کی جزئیات کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنا تھا اگر وہ جزئیات بھی قرآن کریم کے اندر دے دی جاتیں تو وہ بھی غیر متبدل قرار پا جاتیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ جب زمانے کے احوال و کوائف کے بدل جانے سے ان جزئیات پر عمل درآمد مشکل (بلکہ ناممکن) ہو جاتا، تو امت خود نفسِ اسلام ہی سے بدظن ہو جاتی اور خیال کر لیتی کہ اسلام ماضی کے کسی زمانے میں تو ممکن العمل تھا، لیکن اب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا (جیسا کہ پاکستان میں ہوا ہے۔ حکومت نے ہزار برس پہلے کے

تعزیری احکام کو اسلامی احکام کہہ کر نافذ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد، خود صدرِ مملکت کو اعتراف واعلان کرنا پڑا کہ ان احکام پر عمل درآمد ناممکن ہے۔ اس سے ہماری نئی نسل کے دل میں نفسِ اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات ابھرنے شروع ہو گئے ہیں۔) اس سے وہ خود دین ہی کو خیر باد کہہ دیتی۔ قرآن کریم نے سورہ المائدہ کی حسب ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡیَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَـکُمۡ تَسُؤۡکُمۡ ۚ وَاِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡهَا حِیۡنَ یُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَـکُمۡ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدۡ سَاَلَهَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا کٰفِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾

(5:101-102)

اے جماعت مومنین! جن امور کی تصریحات ہم نے خود نہیں کیں انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر (بفرض محال) ان امور کو بھی قرآن میں دے دیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہ ہو سکے گی اور جب تغیّر حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائے گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم (بنی اسرائیل) نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادے ہی کو اتار پھینکا لہٰذا جن جزئیات کا تعین ہم نے خود نہیں کیا تو انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت ایک حدیث میں ملتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ باتیں فرض قرار دی ہیں۔ تو انہیں ضائع نہ کرو کچھ باتیں حرام ٹھہرائی ہیں، تم ان کے قریب تک نہ پھٹکو اس نے کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ امور کے بیان

کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے۔تم ان کے متعلق کریدمت کرو کیونکہ
خدا نے ایسا بھول کر نہیں کیا دانستہ کیا ہے۔
(مشکوٰۃ، باب اعتصام بکتاب وسنت)

نبی اکرم ﷺ نے نظامِ حکومت قائم فرمایا تو قرآنِ کریم کے اصول وقوانین کی جزئیات بھی خود متعین کیں اور اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق بھی۔ یہ سب کچھ صحابہؓ کے مشورہ کے ساتھ (کیونکہ ایسا کرنے کا حضور ﷺ کو حکم دیا گیا تھا (3:159)) اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کیا تھا۔ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہیں رہنا تھا۔ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان میں ردوبدل ہونا ضروری تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں عہدِ رسالت کی کئی ایک جزئیات میں تبدیلی اور اضافہ کیا گیا (تفصیل میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں ملے گی۔) حضور ﷺ نے اپنے ان ارشادات کو اس لئے مرتب کرنے سے روک دیا کہ اُمت انہیں غیر متبدل خیال کرے گی اور اس سے اسی مشکل میں پھنس جائے گی جس کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے خود بھی انہیں مرتب نہ فرمایا اور صحابہؓ کو بھی ایسا کرنے سے منع فرما دیا حضور ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اس سنت نبوی ﷺ کا اتباع کیا اور احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہ فرمایا۔ یہ وجہ تھی جو جامعینِ حدیث کو اپنے سے پہلے کا مرتب شدہ کوئی مجموعہ نہ مل سکا اگر قرآنی نظامِ حکومت، خلافت راشدہ کے بعد مسلسل آگے چلتا تو ضابطۂ قوانین بنانے کے لئے ان مجموعوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ یہ تو اس نظام کے معدوم ہوجانے کا نتیجہ تھا جو'' اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ '' کا مختلف مفہوم ذہنوں میں آیا جس کی وجہ سے اس مقصد کے لئے احادیث کے جمع کرنے کی ضرورت پڑی۔

ان مجموعوں کو کس نے مرتب کیا، اور کس طرح مرتب کیا؟ یہ داستان بھی غور طلب ہے۔ ویسے تو احادیث کے مجموعے کثرت سے ہیں، لیکن ان میں سے (سنیوں کے ہاں) چھ مجموعے مستند سمجھے جاتے ہیں، جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات کے چار مجموعے الگ ہیں۔
یہ کس طرح مرتب ہوئے، اس سلسلے میں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان (جامعین احادیث)

کے پاس کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے لوگوں سے کہا کہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی کوئی روایت کسی سے سنی ہو، وہ ان تک پہنچا دے۔ ان صحاح ستہ میں، مسلم اور بخاری کو صحیحین کہا جاتا ہے اور ان میں بھی بخاری کو سرفہرست رکھا جاتا ہے چنانچہ اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ اس طرح ان کے پاس قریب چھ لاکھ روایات جمع ہوئیں ان میں سے انہوں نے قریب پانچ لاکھ، ترانوے ہزار کو مسترد کر دیا اور باقی سات ہزار (جنہیں انہوں نے اپنے قیاس کے مطابق صحیح سمجھا) اپنے مجموعہ میں شامل کر دیا ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی (2762) کے قریب رہ جاتی ہیں۔ ان ہر شش جامعین کے کوائف حسب ذیل ہیں:

نمبر شمار	نام اور وطن	وفات	کتنی روایات ملیں	کتنی قابل قبول سمجھیں
1۔	امام بخاریؒ (بخارا)	256ھ	چھ لاکھ	2762
2۔	امام مسلمؒ (نیشاپور)	261ھ	تین لاکھ	4348
3۔	ترمذیؒ (ترمذ)	275ھ	تین لاکھ	3115
4۔	ابوداؤدؒ (سیستان)	275ھ	پانچ لاکھ	4800
5۔	ابن ماجہؒ (قزوان)	273ھ	چار لاکھ	4000
6۔	نسائیؒ (صوبہ خراسان کا گاؤں نسا)	303ھ	دو لاکھ	4321

ان تصریحات سے دو باتیں واضح ہیں یعنی

(1) یہ تمام حضرات ایرانی تھے۔ ان میں سے ایک بھی عرب کا رہنے والا نہیں تھا۔

(2) انہوں نے یہ روایات اس طرح جمع کیں کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ اس نے یہ بات اپنے باپ (یا استاد) سے سنی تھی۔ انہوں نے اپنے باپ (وغیرہ) سے اور اس طرح یہ سلسلہ دو سو سال پیچھے جاتے جاتے زبانی کلامی، رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گیا۔ آپ غور کیجئے کہ اس طرح

روایت درروایت کے متعلق کسی صورت میں بھی یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ اس طرح کے بیان کو تو عدالتوں میں بطور شہادت بھی تسلیم نہیں کیا جاتا یعنی اگر کوئی گواہ کہے کہ مجھے اس بات کا ذاتی طور پر علم نہیں لیکن میں نے فلاں سے ایسا سنا ہے، تو عدالت اسے شہادت کے طور پر قبول نہیں کرے گی چہ جائیکہ اس طرح سنی سنائی باتوں کا سلسلہ قریب دوسو سال تک مختلف راویوں کی زبانی آگے چل کر آیا ہو! پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ ان روایات میں بعینہٖ الفاظ نہیں دہرائے جاتے تھے ان الفاظ کا مفہوم آگے منتقل ہوتا تھا یعنی حضور نبی اکرم ﷺ نے کچھ ارشاد فرمایا سننے والے نے اس کا جو مفہوم سمجھا اسے کسی اور کو بتایا اس نے اس سے جو کچھ سمجھا اسے آگے منتقل کر دیا اور اس طرح یہ مفہوم در مفہوم چھ سات راویوں کے ذریعہ آخر الامر جامع احادیث تک پہنچا۔ کیا اس مفہوم کو کسی صورت میں بھی قول رسول اللہ ﷺ کہا جا سکے گا؟

(3) اس طرح کے قریب چھ لاکھ روایات (بلکہ مفاہیم) امام بخاریؒ تک پہنچے۔ ان میں سے انہوں نے اپنے قیاس کے مطابق جس روایت کو صحیح سمجھا اسے رکھ لیا باقیوں کو مسترد کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے پاس وہ کونسا معیار تھا جس کی رو سے وہ یقینی طور پر صحیح اور غلط میں فرق کر لیتے؟ انہوں نے بہر حال، اپنی رائے اور قیاس کے مطابق ہی یہ تفریق کی تھی۔

اب سوچئے کہ جس روایت کو صحیح حدیث کہا جاتا ہے اس کے یقینی طور پر ارشاد رسول اللہ ﷺ ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ یہ مفاہیم مختلف منازل میں سے گذرے اور آخر میں امام بخاریؒ نے اپنے قیاس سے کسی کو صحیح اور کسی کو غلط قرار دے دیا! جنہیں صحیح احادیث رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے، وہ وہ روایات ہیں، جنہیں جامعینِ احادیث نے اپنے قیاس کے مطابق صحیح سمجھا اس سے زیادہ ان کی صحت کی کوئی سند نہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہر حدیث اس طرح درج ملے گی کہ ''قال رسول اللہ ﷺ''۔۔۔ اس کے بعد اس حدیث کے الفاظ اور آخر میں ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ'' یوں، یا جس طرح رسول اللہ نے فرمایا ہو! اس بنا پر، ان لاکھوں حدیثوں میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں جسے خود جامعین حدیث نے یقینی طور کہا ہو کہ حضور ﷺ نے ایسے ہی فرمایا تھا!

یہ ہے پوزیشن ان احادیث کی جو کتبِ احادیث میں جمع ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے

کہ ان کی اطاعت سے ''اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ'' کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ جب سوال پیدا ہوا کہ یہ تو انسانوں کی بیان کردہ روایات ہیں جنہیں انسانوں نے اپنے قیاس سے بعض کو صحیح اور بعض کو ضعیف قرار دیا، اس لئے ان سے یہ فریضہ کیسے ادا ہو جائے گا تو یہ روایت وضع کی گئی کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''مجھے قرآن اور قرآن کے ساتھ اس کی مثل کچھ اور بھی دیا گیا اور وہ میری احادیث ہیں۔'' اس مبینہ روایت کے الفاظ غور طلب ہیں۔

علامہ ابوبکر خطیب بغدادیؒ نے اپنی کتاب ''کفایہ'' میں کوما زسے باہر آئے گا لکھا کہ:

> ''حضرت مقدام بن معدیکربؓ نے فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی یاد رکھو! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی یاد رکھو! عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ لازم پکڑ لو اسی قرآن کو جو کچھ اس قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔''

قطع نظر اس کے کہ جو کچھ اس شخص کی طرف منسوب ہے قرآن کی رو سے حقیقت وہی ہے، اس روایت کے الفاظ بالبداہت کہہ رہے ہیں کہ یہ الفاظ حضور ﷺ کے نہیں ہو سکتے۔ حضور ﷺ کی لطافت، ذوق، شائستگی و مزاجِ حسنِ تکلم کے شایان شان ہی نہیں کہ آپ ﷺ اس قسم کے استہزاء آمیز الفاظ استعمال فرماتے۔۔۔ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت دسمبر 1952ء میں، اس روایت کی اسناد کا تجزیہ کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ قطعاً وضعی ہے۔

اس روایت کی رو سے، روایات کو قرآن کی مثل قرار دینے کے بعد دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تو تمام نوعِ انسان کو چیلنج دیا تھا کہ اس قرآن کی ایک سورۃ کی مثل لا کر دکھاؤ تو یہ روایات قرآن کی مثل کیسے ہو سکتی ہیں؟

اس کے جواب میں ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا کہ احادیث بھی وحی ہیں۔ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی متلو جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور دوسری وحی غیر متلو، جس کی تلاوت نہیں کی جاتی یہ

احادیث ہیں۔(یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا) قرآن میں کہیں بھی وحی کی دو قسمیں نہیں بتائی گئیں اس کی رو سے وحی کی ایک ہی قسم ہے اور وہ قرآن کے اندر مذکور و محفوظ ہے۔

مولانا محمد اسماعیل مرحوم (سابق صدر جمعیت اہل حدیث) اپنے رسالہ ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' میں لکھتے ہیں۔

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا __ جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔
>
> (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث، ص:48)

بخاری اور مسلم کے مجموعوں کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں:

> بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے __ ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔
>
> (ایضاً، ص:55)

بالفاظ دیگر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کے انکار کا وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ہے۔ ان احادیث کا انکار کفر ہے اور ایسا کرنے والا مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

> جبرائیل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔
>
> (ایضاً، ص:60)
>
> جب وحی میں تفریق نہ رہی، اور قرآن اور حدیث میں مذکور وحی ایک ہی قرار پا گئی، تو مولانا مسعود احمد صاحب نے بات کھل کر کہہ دی کہ حدیث کو کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔
>
> (تفہیم اسلام، ایڈیشن 1967ء، ص:72، شائع کردہ اہل حدیث اکادمی، لاہور)

لیکن دونوں کتابیں (قرآن اور حدیث) ہم پایہ نہیں حدیث کا مقام قرآن سے بلند ہے امام اوزاعیؒ کا قول ہے قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں۔

(مختصر جامع بیان العلم، ص:223)

ایک اور امام حدیث یحییٰ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

حدیث قرآن پر قاضی ہے، قرآن حدیث پر قاضی نہیں۔ (ایضاً)

''قاضی'' کے معنی یہ ہیں کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد واقعہ ہو۔ (اور ایسا اکثر ہوتا ہے) تو فیصلہ حدیث کا قابل تسلیم ہوگا نہ کہ قرآن کا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ تھا کہ حدیث قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ ''فتنہ انکارِ حدیث'' میں لکھتے ہیں۔

نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے ___ جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو اسی طرح نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ (ص:82)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

رہی یہ بات کہ قول رسول ﷺ، قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (2:180) ''تمہارے اوپر والدین کے لیے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا وصیتہ للوارث۔'' وارث کے لئے وصیت نہیں

ہے۔'' اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے یعنی وارث کے لیے وصیت ناجائز قرار دی گئی حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قول عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﷺ ، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔(ص:85)

اس کے بعد وہ اس کی علت سمجھاتے ہیں۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ سمجھ نہیں آتا کہ رسول ﷺ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول ﷺ کا قول قرآن کو نسخ کر دے تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رسول ﷺ کا قول اپنا قول نہیں ہوتا وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول ﷺ کا قول بھی خدا کا قول ہے اور جس طرح قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قول رسول ﷺ) دوسرے قول یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔(ص:86)

جن آیات کو حدیث منسوخ کر دیتی ہے (ان حضرات کے عقیدے کی رو سے) ان کی تلاوت باقی رہتی ہے اور حکم منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس کا ایک حصہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ مخالفین نے حضور ﷺ سے کہا کہ اگر آپ ﷺ قرآن میں کچھ تبدیلی کر دیں تو ہم آپ ﷺ سے مفاہمت کر لیں گے اس کے جواب میں خدا کا ارشاد ہوا۔

قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۝ (10:15)

اے رسول (ﷺ)! ان سے کہہ دو کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا میرا منصب تو وحی خداوندی کا اتباع کرنا ہے اور بس اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی مواخذہ خداوندی سے بچ نہیں سکتا میں

اس مواخذہ سے ہمیشہ ڈرتا ہوں۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس رسول ﷺ کا اعلان یہ ہو کیا وہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرنے کا خیال تک بھی دل میں لا سکے گا؟ خود (حدیث کی اہم کتاب) مشکوٰۃ میں یہ روایت موجود ہے کہ:

> حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے کہ میرا کلام، کلام اللہ کو منسوخ نہیں کرتا اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (مشکوٰۃ، جلد اوّل، کتاب اعتصام الکتاب وسنت)

لیکن اس کے باوجود، ان حضرات کا یہی عقیدہ اور عمل ہے کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

عام طور پر (عوام کو مطمئن کرنے کے لئے) کہا جاتا ہے کہ حدیث صرف قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر اور تشریح بیان کرتی ہے۔ اس کا اتنا ہی فریضہ ہے لیکن مودودی صاحب (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ یہ غلط ہے۔

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آ گیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے۔۔۔ مسائل واحکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> (ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر 1950ء)

شروع شروع میں جب احادیث کو پرکھنے کے معیار مقرر کئے گئے تو ان کے سرفہرست یہ معیار تھا کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہو وہ مسترد کر دینے کے قابل۔ لیکن اس سے ایک مشکل پیدا ہو گئی احادیث کی کتابوں میں جہاں ایسی روایات ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں، وہاں ایسی روایات بھی ہیں جو خود قرآن کے خلاف ہیں۔ لیکن

(جیسا کہ مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے کہا تھا) بخاری اور مسلم کی تو کسی ایک حدیث کے انکار سے بھی مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان احادیث کو جو قرآن کے خلاف ہیں، ان کتابوں سے نکال دینے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟ اس مشکل کے حل کے لئے کہہ دیا کہ یہ معیار (کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہی صحیح ہے) سرے سے غلط ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان، الاعتصام (لاہور) کی 23 جنوری 1970ء کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا تھا۔

دسمبر 1965ء کے رسالہ ''فکر و نظر'' راولپنڈی میں لکھا گیا ہے کہ ''حضور ﷺ نے فرمایا:

اذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ فان وافقہ فاقبلوہ والا تذروہ (؟) جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو ورنہ اسے چھوڑ دو۔''

''واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے صحیح نہیں واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ حدیث گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی گئی تھی اسی دور میں ماہرین فن حدیث آئمہ کرام نے ببانگ دہل اعلان کر دیا تھا کہ یہ ہرگز ہرگز فرمانِ رسول (ﷺ) نہیں۔

یعنی یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری طرف منسوب روایات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھو جو اس کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھو جو اس کے خلاف ہو اسے غلط سمجھو، زندیقوں کا مسلک ہے! اہل تقویٰ کا مسلک یہ ہے کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو اسے صحیح سمجھو! یا للعجب۔۔۔

اور اس تضاد کو اس طرح مٹاؤ کہ قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھو۔

آپ نے غور فرمایا کہ ''وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا یہ مفہوم ہمیں کھینچ کر کہاں لے آیا؟ یعنی اب دین نام رہ گیا ان روایات کا جو دو سو سال تک زبانی کلامی بیان ہوتی رہیں اور جنہیں پھر جامعین حدیث نے اپنے قیاس کے مطابق تسلیم کیا ان روایات نے کتاب اللہ کی جگہ لے لی!

سنت:

تشکیل پاکستان کے بعد، ان علماء اور جماعتوں نے (بالخصوص) جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی آخر دم تک مخالفت کی تھی، تقاضا شروع کر دیا کہ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ کروان سے کہا گیا کہ یہاں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں اور علماء میں بھی باہمی اس قدر اختلاف ہے، تو اس صورت میں اس قسم کا ضابطہ قوانین کس طرح مرتب کیا جا سکے گا جسے سب (متفقہ طور پر) اسلامی تسلیم کر لیں کافی ردوکد کے بعد، 1951ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل اکتیس علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ:

1۔ شخصی قوانین ہر فرقہ کے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوں اور

2۔ ملکی قوانین (پبلک لاز) کتاب وسنت کے مطابق ہوں۔

یہ ریزولیوشن (یا منشور) پاس کر کے انہوں نے پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ دیکھ لیجئے! تمام علماء اس مطالبہ پر متفق ہو گئے ہیں۔ اگر اب بھی حکومت اسلامی قوانین مرتب اور نافذ نہیں کرتی تو یہ اس کی بدنیتی اور بددیانتی ہوگی حکومت نے پراپیگنڈہ کے اس طوفان سے بچنے کے لئے اسے آئین میں شامل کر دیا۔

اس متفق علیہ مطالبہ کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھئے سب سے پہلے یہ پوچھئے کہ اسلامی قوانین کو پرسنل لاء اور پبلک لاز میں تقسیم کرنے کے لئے اتھارٹی کونسی ہے؟ قرآنِ کریم میں اس قسم کی تفریق وتخصیص کا شائبہ تک نظر نہیں آتا نہ ہی صدر اوّل میں اس کا کوئی نشان ملتا ہے۔ یہ خالصتاً عہد ملوکیت کی ایجاد ہے جسے انگریزوں نے بھی یہاں برقرار رکھا تھا۔

دوسرے یہ کہ شخصی قوانین ہر فرقہ کے الگ الگ ہوں گے اس سے اس فرقہ بندی کو آئینی سند حاصل ہو گئی جسے قرآنِ کریم نے بہ نص صریح شرک قرار دیا ہے۔

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا

ہوجاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس ہوجاتا ہے___ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے___ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوت کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات، حصہ اوّل، ص:302 تا ص:324)

لیجئے! اس ''سنت'' کا تعین ہوگیا جس کا اتباع دین ہے۔ یعنی پہلے تو جامعین احادیث (امام بخاریؒ) وغیرہ نے ان لاکھوں روایات میں سے جو انہیں ملیں، اپنے قیاس کے مطابق کچھ روایات الگ کرلیں اور انہیں احادیث رسول اللہ ﷺ قرار دے دیا۔ آگے بڑھے تو، مزاج شناس رسول ﷺ کی نگہ بصیرت نے یہ فیصلہ کردیا کہ ان احادیث میں سے ''سنت'' کون کون سی ہے۔ اس طرح ''دین'' کا تعین ہوگیا جسے اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے قیامت تک نظامِ حیات قرار دیا تھا۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے مودودی مرحوم کے اس مسلک کے متعلق فرمایا تھا۔

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی ایک بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول ﷺ کا مزاج شناس تصور کر کے پھر اسے اختیار دے دے کہ اصول محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرلے جسے چاہے رد کردے یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا متعلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کردے کہ میں نے اس میں ''ہیرے کی جوت''

دیکھ لی ہے۔تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنت رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث،ص:63)

اب آیئے ''کتاب وسنت'' کی اس اصطلاح کی طرف جسے ان حضرات نے اسلامی قوانین کی تدوین کے لئے آئین پاکستان میں شامل کرایا تھا۔ہم نے اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ اس معیار کی رو سے قیامت تک بھی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں اس لئے کہ ''سنت'' ہر فرقہ کی الگ ہے جس میں وہ کسی قسم کے ردوبدل کو جائز قرار نہیں دیتے۔ان حضرات کے پاس،اس اعتراض کا جواب،کفر کے فتویٰ کے سوا کیا ہوسکتا تھا! بیس برس تک یہ لوگ اپنے اسی ''جہاد'' میں مصروف رہے لیکن اس کے بعد مودودی مرحوم کو مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ:

کتاب وسنت کی رو سے پبلک لاز کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو شیعہ، اہل حدیث اور حنفیوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پاسکے۔

(ایشیاء،مورخہ 23 اگست 1970ء)

دلچسپ بات یہ ہے کہ مودودی مرحوم نے اِدھر یہ اعلان کیا اور اُدھر اپنی جماعت کے انتخابی منشور میں یہ شق بھی شامل کردی کہ:

جماعت اسلامی کے پیش نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو قرآن وسنت کے اتباع کی پابند ہو۔

بہرحال، جب مودودی مرحوم نے کہا کہ:''کتاب وسنت'' کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پاسکے تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی کیا شکل ہوگی؟ فرمایا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کردی جائے! یعنی ''کتاب وسنت'' کو تو اس لئے متروک قرار دے دیا کہ تمام فرقے اس پر

متفق نہیں ہوسکیں گے اور اس کا علاج یہ بتایا کہ یہاں ایک فرقہ (حنفی) کی فقہ نافذ کردی جائے گویا اس پر سب فرقے متفق ہوجائیں گے!! دوسرے فرقے تو ایک طرف، فقہ کے متعلق خود مودودی مرحوم کے عقائد یہ ہیں کہ:

1۔اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن بابت محرم 1360ھ)

2۔مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان ومکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا نہ اس کی نظر تمام ازمنہ واحوال پر وسیع ہوسکتی ہے لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔

(تفہیمات، حصہ دوم، ص:426)

3۔انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔(تنقیحات، ص:120)

اس کے برعکس تمام زمانی ومکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس علمِ حقیقی ہے، اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرا برابر کوئی تغیّر واقع نہیں ہوتا۔

(تنقیحات، ص:120)

فقہ:

اس مقام پر مختصر الفاظ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ فقہ کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے وجود میں آئی یہ بتایا جاچکا ہے کہ عہدِ عباسیہ میں، احادیث کو اس لئے جمع اور مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے اللہ اور رسول کی اطاعت کا فریضہ ادا کیا جاسکے لیکن اس زمانے تک زندگی کے تقاضے اس

قدر بڑھ چکے تھے کہ احادیث کی رو سے تمام مسائل کا حل مل نہیں سکتا تھا اور اگر ملتا بھی تھا تو احادیث کے عین مطابق عمل کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس دشواری کے پیش نظر بعض مقنّنین نے سوچا کہ اسلام کو بہ ہیئت مجموعی سامنے رکھ کر، اپنے غور وتدبر (تفقہ) کی رو سے ان مسائل کا حل مستنبط کیا جائے ان کے اس طرح وضع کردہ قوانین کو فقہ کہا جاتا ہے اور فقہی احکام کی پیروی کو ''خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب استنباط مسائل کی یہ طرح پڑی تو فقہی قوانین کے بکثرت مجموعے مرتب ہو گئے ان میں سے چار نے زیادہ شہرت حاصل کی تھی یعنی:

نمبر شمار	نام	پیدائش	وفات
1۔	امام اعظمؒ ابوحنیفہ (کوفی)	80ھ	150ھ
2۔	امام مالکؒ (یمنی)	93ھ	179ھ
3۔	امام شافعیؒ (عسقلانی مکی)	150ھ	204ھ
4۔	امام احمد بن حنبل (بغدادی)	164ھ	241ھ

یہ سنی حضرات کے ائمہ فقہ ہیں شیعہ حضرات کی فقہ جعفری الگ ہے۔ سنیوں میں اہل حدیث کا الگ فرقہ ہے جو کسی فقہ کے قائل نہیں وہ براہ راست حدیث پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ احادیث، جامعین حدیث کے قیاس کی رو سے منتخب ہوئیں اور فقہ، فقہاء کے قیاس کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا ذریعہ یہی احادیث یا فقہ ہیں۔ معتقدین حدیث کا عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کی مثل ہے (مثلہ معہ) بلکہ یہ قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے اس طرح فقہ حنفیہ کے ایک مسلمہ امام، ابوالحسنؒ عبید اللہ کرخی کا قول ہے کہ:

> ہر وہ حدیث جو اس طریقہ کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب (ائمہ فقہ) ہیں، یا تو مسئول ہے یا منسوخ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مؤول ہے یا منسوخ۔
>
> (تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری، اردو ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین، اعظم گڑھ 421)

ان حضرات کے نزدیک، دین، فقہ میں تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اب فقہ میں مزید تحقیق و تفتیش یا اجتہاد کی ضرورت ہے نہ ان احکام میں کسی قسم کا ردوبدل ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ خصوصیت کلمات اللہ (احکام وقوانین خداوندی) کی بتائی تھی کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ انسانوں کے وضع کردہ ان احکام (فقہی قوانین) کو ابد تک غیر متبدل قرار دے کر، انہیں قوانین خداوندی کا ہم پایہ بنا دیا یہ ہمارا قیاس نہیں ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ فقہی احکام قرآن کی مثل ہیں۔ فقہ حنفی میں الھدایہ معتبر ترین کتاب ہے۔ اس کی جلد اوّل کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ ''الھدایہ کا لقرآن۔'' (الھدایہ قرآن کی مثل ہے)

(بحوالہ ہفت روزہ ''اہل حدیث''، مورخہ 12 فروری 1982ء)

ان تصریحات کی روشنی میں آپ اس نکتہ پر غور کیجئے جو ہمارا بنیادی موضوع گفتگو ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں (شیعہ فرقہ کو چھوڑ کر) سنیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ہیں جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے ان میں جو روایات آ گئی ہیں وہ غیر متبدل ہیں۔ اس کے بعد فقہ کے (کم از کم) چار آئمہ کی طرف منسوب قوانین ایسے ہیں جو غیر متبدل سمجھے جاتے ہیں۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ ان کے متبعین اپنے اختلافات چھوڑ کر، اُمت واحدہ بن جائیں!

مکاتب فکر:

(ضمناً) ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اور اختلاف کو خدا نے غضب کا موجب۔ جب ان آیات قرآنی کو بہ تکرار و اصرار سامنے لایا گیا جن میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے تو یہ حضرات بڑی مشکل میں پھنس گئے ان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس سے ذرا سی اُمید بندھتی تھی کہ شاید یہ حضرات اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور سوچیں کہ اس شرک کو توحید سے کس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن (معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ) یہ فرقے ہیں ہی نہیں

یہ مکاتب فکر ہیں اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے یہ حضرات بہت خوش ہو گئے کہ اب ہم فرقوں کے پابند رہتے ہوئے بھی مشرک قرار نہیں پائیں گے یعنی رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ دینے سے سمجھ لیا کہ وہ کافر نہیں رہا مسلمان ہو گیا ہے!

ذرا مکاتب فکر اور فرقوں کے فرق پر غور فرمایئے ہمارے ہاں بڑے بڑے مشہور مفکر (فلاسفر) گذرے ہیں (مثلاً) بوعلی سینا، فارابی، رازی، الکندی وغیرہ___ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ''مکتبہ فکر'' (School of Thought) تھا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ بوعلی سینا کے مکتبہ فکر کے پیرو اپنی نماز الگ پڑھتے تھے اور فارابی کا مکتبہ فکر الگ نماز! کیا آج مسلمانوں کے ممالک میں کہیں کوئی گروہ ایسا ہے جو بوعلی سینا کے طریق پر نماز ادا کرتا ہو، یا فارابی کے طریق پر!___ ان کے برعکس ذرا فرقوں پر نگاہ ڈالئے بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا___ صلوا کما رایتمونی اصلی

(کتاب الاذان)

نمازوں کا اختلاف:

''یعنی تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو''___ اگر یہ روایت نہ بھی ہوتی تو بھی بات واضح تھی کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ ساری عمر نمازیں ادا فرمائیں انہوں نے نہ صرف یہ کہ حضور ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا بلکہ خود بھی اسی طرح نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد آج تک نہ تو اُمت میں ذرا سا بھی انقطاع (GAP) واقعہ ہوا یعنی یہ حادثہ ایک لمحہ کے لئے بھی رونما نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان نہ رہے ہوں۔ نہ ہی کبھی نماز کا فریضہ ترک کیا گیا بالفاظ دیگر لاکھوں مسلمانوں نے حضور ﷺ کے ساتھ، حضور ﷺ جیسی نماز ادا کی اور اس کے بعد اس عمل محسوس کا تسلسل آج تک جاری ہے۔ اس سے عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ عمل محسوس آج بھی بعینہ ویسا ہونا چاہئے جیسا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا لیکن امر واقعہ کیا ہے؟ یہ کہ مسلمانوں میں متعدد فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز

الگ الگ ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ جو نماز وہ ادا کرتے ہیں وہ بعینہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ ادا فرماتے تھے! کیا عقل سلیم اسے باور کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟ یہ فرقے کس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ان کی نماز ''جزئیات'' تک رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟ احادیث کی رو سے فقہ کی رو سے مختلف حدیثیں اور فقہی احکام ہر فرقہ کی نماز کی تائید میں سند بہم پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں بحث اس امر پر چل پڑتی ہے کہ تمہاری حدیث ضعیف ہے اور ہماری صحیح۔

کہہ دیا جاتا ہے کہ (شیعہ حضرات کی نماز سے قطع نظر) سنیوں کے مختلف فرقوں کی نماز میں جو اختلاف ہے وہ فرعی سا ہے اصولی طور پر سب کے ہاں نماز مشترک ہے اور ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں سو اول تو یہی غلط ہے کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ ان فرقوں کے نزدیک انہیں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ ایک فرقے کے پیروکار کسی دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا تو کجا اگر (مثلاً) نیچی آواز سے آمین کہنے والا اونچی آواز سے آمین کہنے والوں کی مسجد میں نماز پڑھ لے تو وہ، اگر اپنی مسجد کا فرش اکھیڑ نہیں دیں گے تو کم از کم، اسے دس بار دھو کر پاک اور صاف ضرور کریں گے یہ جو آئے دن ''وہابیوں اور بدعتیوں'' یا ''بریلویوں اور دیوبندیوں'' کی مسجدوں میں تنازعے اٹھتے ہیں ___ امام قتل کر دئے جاتے ہیں ___ مقتدیوں میں دنگا فساد ہوتا ہے ___ پولیس مداخلت کرتی ہے ___ مسجد پر تالہ پڑ جاتا ہے اور مقدمہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے ___ تو یہ نماز کے فروعی اختلاف کی وجہ ہی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا، یہ کہنا کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں، حقیقت کا بطلان اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے فرار کی راہ اختیار کرنے کے مرادف ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ جب کسی حکم کو خدا (یا اس کے رسول، کا متعین فرمودہ قرار دیا جائے تو اس کے اصول اور فروع سب اپنی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی اختلافات نہیں کیا جا سکتا مثلاً قرآنِ کریم نے وضو کے سلسلے میں کہا ہے۔ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (5:6) اپنے منہ دھویا کرو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک۔ اب اگر کوئی شخص اپنے

ہاتھ پہنچوں تک دھوئے، اور دوسرا کہنیوں تک، تو کیا آپ کہہ دیں گے کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک کیونکہ یہ فرق محض فرعی ہے اصولی نہیں؟ ایسا کہنا صریحاً غلط ہوگا ان میں سے ٹھیک ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہی ٹھیک ہوسکتا ہے جس کا عمل قرآن کے حکم کے مطابق ہو لہٰذا، نماز کی جو جزئیات رسول اللہ ﷺ نے متعین فرمائی تھیں، جب تک ان کی بعینہٖ پابندی نہیں کی جائے گی، نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق قرار نہیں پائے گی یہ کہنا کہ کسی نے ہاتھ کانوں تک اٹھالئے یا نیچے رکھے ہاتھ سینے تک باندھ لئے یا زیر ناف آمین بالجہر کرلی یا خفی پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا یا اتنا امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھی یا نہ پڑھی، یا فلاں دعایوں پڑھ لی یا یوں۔ تراویح آٹھ پڑھ لیں یا بیس، عید کی نماز میں تکبیریں اتنی کہہ لیں یا اتنی نماز فلاں وقت پڑھ لی یا فلاں وقت اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ جزئیات کا فرق ہے محض اعتراض سے بچنے کا بہانہ ہے۔ اگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو (مثلاً) کسی اہل حدیث سے کہئے کہ وہ حنفیوں کی سی نماز پڑھ کر اعلان کردے کہ اس کی نماز ہوگئی ہے؟ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

آپ نے یہ اعتراض عام طور پر سنا ہوگا کہ اگر ہم احادیث کو نہ مانیں تو بتایئے کہ نماز کس طرح پڑھی جائے گی! اس کا اولین جواب تو تصریحات بالا میں موجود ہے کہ احادیث کی رو سے کونسی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کہا جائے گا؟

اس سلسلہ میں ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ آیا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ حکم مجمل ہے اور اس اجمال کی تفصیل احادیث میں ملتی ہے۔ اس تفصیل کے مطابق نماز ادا کرنے سے خدا کے حکم کی تعمیل ہوسکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔

قرآنِ کریم میں یہ بھی حکم آیا ہے کہ اِعۡدِلُوۡا ۟ (5:6) یعنی عدل کرو یہ حکم بھی اسی طرح مجمل ہے جس طرح اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کا حکم کیا اِعۡدِلُوۡا ۟ کے اجمالی حکم کی تعمیل کے لئے احادیث رسول اللہ ﷺ میں دی گئی تفاصیل کی ضرورت نہیں؟ یعنی ان تفاصیل کی کہ عدل کی مشینری کس قسم کی ہوگی، اس کا طریق کار (Procedure) کیا ہوگا؟ نماز کی تفاصیل اور جزئیات کے متعلق تو انبار در انبار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور تصنیف کی

جارہی ہیں۔ کیا عدل کی مشینری اس کی جزئیات، اس کے طریق کار کی تفاصیل بھی احادیث کی رو سے اس طرح مرتب کی گئی ہیں؟ اگر نہیں کی گئیں تو کیوں؟ یہ واضح ہے کہ نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں عدل کا فریضہ ادا فرماتے تھے! اطاعت سنت کی رو سے تو آج بھی مساجد ہی میں عدالتیں قائم ہونی چاہئیں۔ کیا علماء کرام میں سے کسی نے آج تک یہ فتویٰ دیا ہے کہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی عمارات میں بیٹھ کر عدل کرنا خلاف سنت رسول اللہ ﷺ لہٰذا ناجائز ہے؟ اگر ایسا نہیں کیا گیا (اور ظاہر ہے نہیں کیا گیا) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کی جزئیات اور نظام عدل کی جزئیات میں یہ فرق کیوں کیا جارہا ہے؟ یا مثلاً قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:182) ''تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔'' روزوں کے جزئیاتی احکام بھی احادیث کی رو سے مرتب کئے جاتے ہیں اور ان کی پابندی ضروری۔ ان میں سے کسی ایک جزئیہ کی خلاف ورزی سے بھی روزہ نہیں ہوتا!

اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم میں یہ بھی آیا ہے کہ: کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ (2:217) ''تم پر جنگ فرض قرار دیا گیا ہے۔'' کیا قتال (جنگ) کی بھی روزوں جیسی جزئیات مرتب کی گئی ہیں؟

حضور ﷺ کے زمانے میں جنگ تیروں اور تلواروں کے ذریعے لڑی جاتی تھی۔ کیا آج بھی اس سنت رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں) جنگ تیروں اور تلواروں سے لڑی جائے گی، اور بندوقوں اور توپوں کے ذریعے جنگ لڑنا خلاف سنت۔ لہٰذا، ناجائز قرار پا جائے گا؟

سوچئے کہ نماز اور روزہ سے متعلق احکام میں سنت رسول اللہ ﷺ کی مطابقت کے بارے میں اس قدر شدت اور عدل اور قتال کے احکام کے سلسلہ میں سنت رسول اللہ ﷺ سے ایسی بے اعتنائی! ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب واضح ہے کہ یہ احکام اس زمانے میں مدون ہوئے تھے جب مذہب اور حکومت میں ثنویت پیدا ہو چکی تھی جس کی رو سے نماز، روزہ مذہب کے دائرے میں آئے تھے اور عدل اور قتال حکومت کے حیطہ اقتدار میں لہٰذا

اتباع سنت کی تاکید اور شدت اعتقادات اور عبادات کے باب میں برتی گئی اور نظامِ حکومت کو مملکت کے حوالے کر دیا گیا۔

اسلامی مملکت میں ایسا نہیں ہوگا، اس میں قرآن کے تمام مجمل احکام کی تفصیلات، مملکت متعین کرے گی۔

❁❁❁

بات یہاں سے چلی تھی کہ اور تو اور نماز جیسے بنیادی فریضہ میں بھی اس قدر اختلافات صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور ان کی بنیاد احادیث اور فقہ پر ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ کیا آج کوئی ذریعہ ایسا ہے جس سے حتمی اور یقینی طور پر متعین کیا جاسکے کہ رسول اللہ ﷺ کس طریق کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے؟ اسی ایک مثال پر دیگر احکام کو قیاس کر لیجئے! اور پھر آپ خود ہی فیصلہ فرمالیجئے کہ ان احکام کی ادائیگی سے کیا یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ہم ''**اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ**'' کا فریضہ ادا کر رہے ہیں!

یہ تمام خلفشار اور انتشار یہ سب اختلاف وافتراق یہ ساری بے یقینی اور نامحکمی یہ سب اس لئے ہے کہ صدرِ اوّل کے بعد، ملوکیت آ گئی اور '' **اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ** '' کا قرآنی مفہوم امت کی نگاہوں سے اجھل ہوگیا، اور اس کا مفہوم ہم نے اپنے ذہن سے متعین کر لیا۔ **اَطِیْعُوا اللّٰہَ** کے متعلق کہہ لیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ اور **اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ** کا ذریعہ وہ احادیث جنہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا اور ان پر مبنی فقہی احکام۔ جب تک دین کی اس اساس اور بنیاد کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا، نہ امت میں وحدت پیدا ہوسکتی ہے، نہ دین کا تمکن، اور اسلام کا احیاء ہوسکتا ہے آیئے ہم دیکھیں کہ اس کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

❁❁❁

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا قرآنی مفہوم

مختصر الفاظ میں یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ اب ہم اس اجمال کی تفصیل کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' سے دو الگ الگ اطاعتیں مقصود نہیں۔ (یعنی اللہ کی اطاعت الگ اور رسول کی اطاعت الگ) دین میں اطاعت صرف خدا کی مطلوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ خدا کی اطاعت کرتے تھے اور خدا ہی کی اطاعت کراتے تھے۔ حضور کا عظیم ترین مقام و منصب عبدہ (خدا کا محکوم و اطاعت گزار) ہے۔ اس کا علان ہم ساری دنیا کے سامنے یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ:

اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ

اسلام، مذہب نہیں جس میں ہر شخص انفرادی طور پر، خدا کی پرستش، بندگی، پوجا پاٹ، (Worship) کرے تو اطاعت کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ دین ہے یعنی نظامِ حیات جس میں خدا کی اطاعت صرف اپنی آزاد مملکت میں ہو سکتی ہے۔ یہ مملکت (یا اس کی حکومت) دنیا میں منفرد تھی۔ یعنی اس میں محکومیت کسی انسان کی نہیں ہوتی تھی۔ صرف خدا کی ہوتی تھی اور خدا نے اس مقصد کے لئے اپنی کتاب نازل کی تھی۔ لہٰذا اس میں اطاعت صرف کتاب اللہ کی تھی۔

لیکن انسانی دنیا میں کتاب اللہ کی حکومت بھی نظام کے تحت ممکن تھی۔ یہ نظام نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا تھا جس کے اولین سربراہ بھی حضور ﷺ خود تھے۔

اس انداز حکومت اور اطاعت کے لئے قرآنِ کریم نے ایک منفرد اصطلاح مقرر کی یعنی ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' اس سے مراد یہ تھی کہ خدا کی اطاعت لیکن انفرادی طور پر نہیں اس نظام کی رو سے جسے رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا اور رسول کی بھی اپنی اطاعت نہیں بلکہ رسول ﷺ کی وساطت سے خدا کی اطاعت۔ ایک آئینی نظامِ حکومت میں، حکومت

کے ادنیٰ سے عامل کے حکم کی اطاعت اس کی اطاعت نہیں ہوتی اس حاکم اعلیٰ کی اطاعت ہوتی ہے جس کا وہ کارپرداز ہوتا ہے۔ جب چوراہے پر کھڑا سپاہی آپ سے کہتا ہے کہ بائیں طرف چلئے، تو وہ آپ سے اپنا حکم نہیں منواتا حاکم اعلیٰ کا حکم منواتا ہے۔ قرآنی حکومت میں بھی صورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب وہ کہتا مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ (4:80) تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم جو رسول کے حکم کی اطاعت کرتے ہو تو یہ رسول کی اطاعت نہیں یہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ رسول احکام خداوندی کی اطاعت کراتا ہے۔ اپنی نہیں اس کا منصبی فریضہ ہی خدا کی اطاعت کرانا ہے۔ اطاعت کے اسی انداز کو وہ ''**اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ**'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے قرآنِ کریم میں اس کے بکثرت شواہد موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

1۔ سورۃ المائدہ کی مشہور آیت ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَاَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَلَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ۙ (5:33)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے:

بلا شبہ ان لوگوں کی، جو ''اللہ اور اس کے رسول (ﷺ)'' کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور ملک میں فساد پھیلانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں، یہ سزا ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے یہ ان کے لئے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔

اس میں ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ متقدمین سے لے کر متاخرین تک، سب کے نزدیک اس سے مراد اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کرنے

کے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں، اور نواب صدیق حسن خان (مرحوم) نے فتح البیان میں لکھا ہے۔

حضرت ابن عباس سعید بن مسیب، مجاہد، عطاء، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعی، ضحاک اور ابوثور نے کہا کہ جس نے اسلامی محروسہ (ریاست) میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پرخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام (سربراہ مملکت) کو اختیار ہے کہ جو چاہے سزا دے۔

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے، تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں میں سے جو سزا اس کو چاہے دے۔''

ہمارے زمانے میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی تفسیر، تفہیم القرآن میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(فساد فی الارض میں) زمین سے مراد وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن وانتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی مملکت نے لے رکھی ہو اور ''خدا اور رسول'' سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلامی حکومت نے ملک میں قائم رکھا ہو__ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہوجائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا،__ خدا اور رسول کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیرات ہند میں ہر شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے۔ ''بادشاہ کے خلاف لڑائی'' (Waging War -- Against the King) کا مجرم قرار دیا گیا ہے چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی اور دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ کی دست رس سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔

(تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص:465، ایڈیشن 1951ء)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں ''خدا اور رسول'' سے مراد اسلامی نظامِ حکومت ہے۔(یہ تقسیم ہند سے پہلے کی تحریر نظر آتی ہے۔)

اس مقام پر ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے ہم نے اوپر کہا ہے کہ آئینی حکومت میں صورت یہ ہوتی ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ عامل حکومت جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس حکم کی اطاعت اس عامل کی اطاعت نہیں ہوتی، اس حکومت کی اطاعت ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ دوسری طرف حکومت کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کرانے میں افسر مجاز جو کچھ کرتا ہے، حکومت اس کا اعلان کرتی ہے کہ وہ اس نے نہیں کیا، خود حکومت نے کیا ہے۔ حکومت اس کی پوری پوری ذمہ داری لیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ (مثلاً) جنگِ بدر میں، نبی اکرم ﷺ اور جماعت مجاہدین، مخالفین کو تہِ تیغ کرتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہوتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ (8:17) ''تم نے انہیں قتل نہیں کیا تھا، ہم نے قتل کیا تھا۔'' اور نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (8:17) ''میدانِ جنگ میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔'' ان کے ہر اقدام کی ذمہ داری خدا خود اپنے اوپر لیتا تھا۔ یا (مثلاً) صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ایک اور نازک وقت آ گیا کہ جماعت مومنین نے، خدا کے ہاتھ اپنی جان و مال بیچ دینے کا جو معاہدہ کر رکھا تھا (9:111) اس کی تجدید کی ضرورت پڑ گئی تھی قاعدہ کے مطابق، صحابہؓ آتے تھے۔ تجدید معاہدہ (بیعت) کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے تھے اور حضور ﷺ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ اس بیعت کی توثیق فرما دیتے تھے اس موقعہ پر ارشادِ خداوندی ہوا کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ (48:10) ''اے رسول (ﷺ)! تمہارے جو رفقاء تجدید معاہدہ کے لئے جو تمہاری بیعت کرتے تھے، وہ تمہاری بیعت نہیں در حقیقت ہماری بیعت تھی۔ ان کے ہاتھ کے اوپر تمہارا ہاتھ نہیں تھا۔ اللہ کا ہاتھ تھا۔'' آئینی حکومت میں ہوتا ہی یہی ہے۔ حکومت کے ساتھ جتنے معاہدات ہوتے ہیں، افسران مجاز ان

پر دستخط کرتے ہیں اور حکومت ان کی ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ معاہدہ خود حکومت کے ساتھ ہوا ہے مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ (4:80) کا مفہوم یہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ حکومت اس کا بھی اعلان کرتی ہے کہ اس معاہدہ کی پابندی موجودہ حکومت پر ہی لازم نہیں اس حکومت کے بعد بھی جو حکومت آئینی طور پر قائم ہوگی (اس حکومت کی جانشین ہوگی) اس پر بھی اس کی پابندی لازمی ہوگی۔

یہ تھا مفہوم حضور ﷺ کے اس ارشاد کا کہ تم پر میرے طریق کی پیروی اور میرے خلفاء (جانشینوں) کے طریق کی پیروی ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں انسانوں کے سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، انہیں وہ اس نظام کے ذریعے پوری کراتا ہے۔ براہ راست خود آکر پورا نہیں کرتا۔ (اس موضوع پر میں اس سے پہلے بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں)۔

1۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آیئے ہم کہہ رہے تھے کہ ''اللہ اور رسول کے خلاف جنگ'' سے مراد نظامِ حکومت خداوندی کے خلاف جنگ تھی۔ اس سلسلہ میں سورۃ المائدہ کی آیت (5:33) ہمارے سامنے آچکی ہے۔ دیگر حوالہ جات درج ذیل ہیں۔

2۔ ''خدا اور رسول ﷺ کے خلاف جنگ'' کے متعلق مسجد ضرار کے سلسلہ میں ہے کہ وہ مسجد پناہ گاہ تھی ان لوگوں کے لئے لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (9:107) جنہوں نے خدا اور رسول کے خلاف جنگ کی تھی نیز (9:63) اسی طرح سورۃ البقرہ میں ہے کہ اگر تم لوگ بقایا ربو، چھوڑو گے تو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ۚ (2:279) تو اسے ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف سے اعلان جنگ سمجھو۔

3۔ سورۃ الانفال کی پہلی آیت ہے قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ ۚ (8:1) ''انفال اللہ اور رسول ﷺ کے لئے ہے۔'' (انفال کے معنی عام طور پر مالِ غنیمت کئے جاتے ہیں۔) یہاں کہا ہے کہ انفال، اللہ اور رسول ﷺ کے لئے ہیں۔

امام ابن جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ''اللہ اور رسول ﷺ'' سے مراد امام وقت (یعنی اس وقت کی حکومت کا سربراہ) ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اس آیت کے تحت اپنے تشریحی نوٹ میں لکھتے ہیں کہ:

مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیے کہ جو جس کے ہاتھ پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔

(ترجمان القرآن، جلد دوم، ص:53)

اسی طرح مالِ غنیمت کے خمس کے متعلق ہے کہ وہ ''اللہ اور رسول ﷺ'' __ کے لئے ہے۔

4۔ سورۃ الحشر میں ان یہودیوں کے متعلق جنہوں نے اسلامی مملکت کے خلاف سرکشی اختیار کی تھی، فرمایا کہ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ (59:4) ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اذیت پہنچاتے ہیں __ ''اگر یہاں اللہ سے مراد ''اللہ تعالیٰ'' لئے جائیں تو بات بن ہی نہیں سکتی (اس لئے کہ خدا کو) اذیت کون پہنچا سکتا ہے اس سے مراد اسلامی نظام کے لئے اذیت اور پریشانی کا موجب بننا ہے۔

5۔ اب آگے بڑھئے فتح مکہ کے بعد اسلامی مملکت نے فیصلہ کیا کہ مشرکین کو کعبہ میں آنے سے روک دیا جائے اس کے لئے 9ھ حج اکبر کے اجتماع میں اعلان کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ؕ (9:1) ---وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ (9:3)

جن مشرکین کے ساتھ تم نے صلح کا معاہدہ کیا تھا (لیکن انہوں نے اس معاہدہ

کی خلاف ورزی کی) ان کے لئے اس حج اکبر کے اجتماع میں، اعلان کر دو کہ خدا اور رسول ﷺ نے اس معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا اور اس کے بعد وہ اس باب میں بری الذمہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ معاہدات کئے بھی حکومت کی طرف سے جاتے ہیں اور انہیں کالعدم بھی حکومت ہی کی طرف سے قرار دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ''اللہ اور رسول ﷺ'' کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

6۔ قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی آئی ہیں جن میں ''اللہ اور رسول ﷺ'' کے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کے لئے صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ عربی زبان کے قاعدے کی رو سے، ان کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہئے تھا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ''اللہ اور رسول ﷺ'' سے دو الگ الگ اطاعتیں مراد نہیں بلکہ ایک ہی مراد ہے۔ یعنی نظامِ حکومت کی اطاعت (مثلاً)

ا۔ سورہ انفال میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَوَلَّوۡا عَنۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۰﴾ (8:20)

اے جماعت مومنین! تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس سے (عنہ ___ واحد کا صیغہ ہے) روگردانی نہ کرو درآنحالیکہ تم اس حکم کو سن رہے ہو (اس کی تشریح ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔)

ب۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ ۚ (8:24)

اے جماعت مومنین! تم ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی دعوت پر لبیک کہو جبکہ وہ (صیغہ واحد) تمہیں اس امر کی طرف بلا رہا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے

گا۔(نیز 3:171)

ج۔سورۃ النور میں ہے:

وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنۡ یَّکُنۡ لَّہُمُ الۡحَقُّ یَاۡتُوۡۤا اِلَیۡہِ مُذۡعِنِیۡنَ ﴿۴۹﴾ (24:48-49)

اور جب (ان منافقین کو) اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ (صیغہ واحد) ان کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کر لیتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو تو پھر یہ اس کی طرف (صیغہ واحد) سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

د۔اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے:

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡہِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِیۡعُوۡہُ تَہۡتَدُوۡا ؕ وَمَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۵۴﴾ (24:54)

اے رسول ﷺ! ان سے کہہ دو کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کریں ازاں بعد اگر یہ اس اطاعت سے روگردانی کرنے لگ جائیں تو یہ سمجھ رکھیں کہ اس پر (صیغہ واحد) صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہے اور وہ تبلیغ احکامِ خداوندی ہے اور ان پر ان کی ذمہ داری اگر انہوں نے اس کی (صیغہ واحد) اطاعت کر لی تو صحیح راستے پر لگ جائیں گے۔

ان آیات میں دیکھئے! ''اللہ اور رسول ﷺ'' کے الفاظ آئے ہیں لیکن صیغے اور ضمائر واحد کے استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ اس حقیقت کی بین دلیل ہے کہ اس اصطلاح سے مفہوم ___ اسلامی نظامِ حکومت ہے۔

7۔آیت (8:20) میں کہا گیا ہے'' اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَا تَوَلَّوۡا عَنۡہُ وَاَنۡتُمۡ

تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۰﴾ ''تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی ___ اور اس سے روگردانی نہ کرو جبکہ تم سن رہے ہو۔''

سمع و طاعت:

وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۰﴾ (تم سن رہے ہو) اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ کتاب تو صامت (خاموش) الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی آواز سنائی نہیں دیتی اس کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جس کا حکم سنا جائے قرآنِ کریم میں اطاعت کے لئے سماعت (سننے) کی شرط متعدد مقامات میں آئی ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (2:285) مومنین کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں ___ ''ہم نے اس حکم کو سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ سورۃ المائدہ میں ہے اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۙ (5:7) جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ سورہ توبہ میں ہے کہ مومنین کا شیوہ ہے کہ: (24:51) ''جب انہیں اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ (صیغہ واحد) ان کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ دین میں خالی کتاب کی اطاعت ممکن نہیں اس کے لئے زندہ اٹھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔ جو حسب موقعہ اور ضرورت، کتاب کے احکام کا آرڈر دے اور جماعت اس آرڈر کی تعمیل کرے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے جو نظام قائم کیا تھا اس میں حضور ﷺ خود وہ پہلی زندہ اتھارٹی تھے جن کے آرڈرز کو سنا جاتا تھا اور ان کی اطاعت کی جاتی تھی یہی وہ نظام تھا جسے حضور ﷺ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ جب تک وہ نظام قائم رہا، کتاب اللہ کی اطاعت، ایک زندہ اتھارٹی کی وساطت سے ہوتی رہی جب وہ نظام درہم برہم ہو گیا تو (قرآنی حکومت کے آرڈر دینے والی) زندہ اتھارٹی باقی نہ رہی۔ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا اور اطاعت کے لئے مجرد کتابوں کو کافی سمجھ لیا گیا اس کا نتیجہ وہ اختلاف و افتراق ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ زندہ اتھارٹی وہ مرکز ہوتی ہے جس کے ساتھ وابستگی سے اُمت کی وحدت

قائم رہتی ہے وہ نہ رہے تو وحدت اُمت کی کوئی صورت ہو نہیں سکتی۔ آخر میں ہم ایک ایسی آیت سامنے لاتے ہیں جس کے بعد یہ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی کہ قرآن کی رو سے، ''اللہ اور رسول ﷺ'' سے مراد، قرآنی نظامِ حکومت ہے۔ یہ نظام ابتداءً مدینہ میں قائم ہوا تھا۔ مسلمان دیگر مقامات (بالخصوص مکہ) میں بھی تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا۔ (بلکہ اسے ایمان کی شرط قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں دیکھئے اس کے لئے الفاظ کونسے استعمال کئے گئے تھے۔ فرمایا:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۰۰ (4:100)

جو شخص خدا کی راہ میں ہجرت کرے گا اسے دوسرے مقام میں بہت سی پناہ گاہیں، اور کشائش کی راہیں مل جائیں گی جو شخص، اللہ اور رسول ﷺ، کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکلے، اگر وہ اپنی منزل مقصود تک نہ بھی پہنچ پائے اور اسے راستے ہی میں موت آجائے تو خدا کے ہاں سے اسے بھی پورا پورا اجر مل جائے گا۔ نظامِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کے پورے پورے سامان موجود ہوتے ہیں۔

غور فرمایئے یہاں حکم تھا اسلامی نظام کی طرف ہجرت کرنے کا اور اس کے لئے ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف جانے کے الفاظ آئے ہیں اگر خالی، رسول ﷺ، کا لفظ ہوتا تو پھر بھی کہا جاسکتا تھا کہ اس سے مراد وہ مقام (مدینہ) ہے جہاں حضور ﷺ اقامت پذیر ہیں۔ لیکن یہاں رسول ﷺ کے ساتھ، اللہ کا لفظ بھی آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص مقام میں اقامت پذیر نہیں ہوتا کہ اس مقام کی طرف جانے کو ہجرت قرار دیا جائے۔ لامحالہ، اللہ اور رسول ﷺ، سے مراد ہی اس مقام کی طرف ہجرت ہے جہاں اسلامی نظام قائم ہو گیا تھا۔

اس ضمن میں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ مکہ کے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا یہ حکم اس زمانے میں ملا تھا جب نظامِ خداوندی مدینہ میں قائم ہوا تھا اور مکہ میں غیر

خداوندی نظام رائج تھا۔ بعد میں جبکہ مکہ فتح ہوا اور وہاں بھی قرآنی نظام رائج ہو گیا تو پھر وہاں کے مسلمانوں کو ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نہیں کہا گیا یہ اس لئے کہ اس کے بعد ''اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت'' مکہ میں بھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح جب قرآنی مملکت دور دراز کے علاقوں میں بھی پھیل گئی اور وہاں بھی اسلامی نظام قائم ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ وہاں کے مسلمانوں سے نہیں کہا گیا کہ وہ ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف ہجرت کریں، بلکہ خود مدینہ کے مسلمان ان علاقوں میں جا جا کر بس گئے یہ اس لئے کہ اب وہاں بھی ''اللہ اور رسول ﷺ'' (نظامِ حکومت خداوندی) موجود تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' کا مفہوم کیا ہے اسلام کے صدرِ اوّل (عہدِ رسالت وخلافتِ راشدہ) میں اس کا یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ بعد میں جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو نظامِ حکومت خداوندی بھی باقی نہ رہا، اور اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم کی مختلف اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' میں اللہ کی اطاعت الگ اور رسول کی ﷺ اطاعت الگ تصور کر لی گئی اور رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے روایات کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت لاحق ہو گئی۔ اگر اُمت کی قسمت یاوری کرتی تو سوچا جاتا کہ وہ کونسی کڑی گم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے دین کا سارا نقشہ بدل گیا ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اُمت دین کی جگہ مذہب پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی اس کے بعد آج تک یہی کیفیت چلی آ رہی ہے۔ اگر غلط کانٹا مڑنے سے گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑے تو ابتداً (غلط اور صحیح پٹڑیوں میں) چند انچوں کا فرق ہوتا ہے لیکن جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جائے، وہ منزل سے دور تر ہوتی جاتی ہے اور جس قدر تیز رفتار سے وہ چلے، منزل سے اس کا بعد اسی نسبت سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس ہزار برس میں، اُمت کی گاڑی کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ جتنی کوششیں ''اسلام'' کے فروغ کے لئے کی جاتی ہیں، ان سے مذہب کی گرہیں اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں اور چونکہ مذہب پیشہ (Profession) بن چکا ہے اس لئے اس سے وابستہ مفاد پرستیاں ان گرہوں کو اور بھی زور سے کستی رہتی ہیں۔

اندریں حالات، دین کا احیاء ان سعادت مند افراد کے ذریعے ہی ممکن ہوگا جو دین کے قرآنی تصور کو اچھی طرح سمجھ کر، اسے عملی پیکر میں متشکل کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں لیکن اس کے لئے دین کے تصور کا سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہوگا اس کے ساتھ، اپنی سیرت و کردار کو حضور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے قالب میں ڈھالنا بھی ضروری ہوگا۔ یہ شرط جذباتی نہیں، خود خدا کی عائد کردہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) ''یہ حقیقت ہے کہ رسول ﷺ کی زندگی تمہارے لئے بہترین (بلکہ حسین ترین) ماڈل ہے۔'' (اگرچہ یہ آیت (جنگ احزاب کے موقعہ پر) ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے جہاں حضور ﷺ نے بے حد نازک مقام پر انتہائی شجاعت اور استقامت کا ثبوت دیا تھا، لیکن میرے نزدیک اس کا اطلاق حضور ﷺ کی پوری کی پوری سیرت پر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ جس بلندی کردار اور پاکیزگی سیرت کی مظہر تھی، وہ اُمت (ہی نہیں تمام عام انسانیت) کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس کی پیروی اتباع سنت رسول اللہ ﷺ کہلائے گی۔) اس ماڈل کے بنیادی خط و خال بھی اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کے اندر محفوظ کر دیئے ہیں۔ میں نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ قرآنی آئینہ کے مطابق مرتب کی ہے (جو معراجِ انسانیت کے نام سے، قریب پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔) اس میں سیرتِ نبوی ﷺ کے بنیادی عنوانات قرآن سے لے کر احادیث اور تاریخ سے وہ واقعات لئے گئے ہیں جو اس قرآنی عنوان کی تائید کرتے ہیں۔ اس سیرتِ طیبہ کو بطورِ ماڈل سامنے رکھنے سے مومن کے اندر وہ صفات منعکس ہونے لگ جاتی ہیں۔ یہ ہے مراد اسوۂ حسنہ کی پیروی سے۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ احکام کی اطاعت اور اسوہ کی پیروی میں بنیادی فرق ہے۔ احکام کی اطاعت تو اسی نظام کی رو سے ہوگی جس کی تشریح سابقہ صفحات میں کی گئی ہے۔ اسوہ رسول اللہ ﷺ کے معنی ہوں گے اپنے اندر ان صفات کا پیدا کرنا جن کی حسین و جمیل مظہر حضور رسالتمآب ﷺ کی ذات اقدس تھی۔ ان صفات کے حاملین کی جماعت ہی اس قابل ہوگی کہ وہ نظامِ خداوندی کو از سر نو قائم کر سکے۔ خدا کے وعدہ کے مطابق، قائم تو اسے بہر حال ہونا ہے۔ دیکھیں یہ سعادت کس خطہ زمین اور کن طالع مند افراد کے حصے میں آتی ہے۔ یہ اسی

سرزمین میں قائم ہو سکے گی جس میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل نہ ہو۔اس نظامِ خداوندی کی اطاعت بمنزلہ ''اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت'' کے ہوگی۔

اس نظام میں اطاعت، قرآنِ کریم کے قوانین واصول واقدار کی ہوگی ان قوانین کے نفاذ کے طور طریق اور ان اصول واقدار کی جزئیات، اُمت کے مشورہ سے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کی جائیں گی۔ایسا کرنے میں، روایات اور فقہ میں جو کچھ قرآن کے خلاف نہیں ہوگا اس سے بطور نظائر مدد لی جائے گی۔ان کی حیثیت غیر متبدل، ابدی قوانین کی نہیں ہوگی اللہ تعالیٰ نے لاتبدیل، (غیر متبدل) صرف کلمات اللہ کو قرار دیا ہے۔خود خلافت راشدہ کے زمانے میں، حضور ﷺ کے عہد کے کئی ایک احکام میں تبدیلیاں بھی کی گئیں اور نئے احکام کا اضافہ بھی۔(تفصیل اس کی میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں ملے گی۔) ایسا ہی ہر نظامِ خداوندی میں ہوگا جو امور (قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے) اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے، ان میں کسی بعد کی حکومت میں تو ایک طرف، خود اسی حکومت کے دوران، بہ تقاضائے حالات، ردوبدل اور حک واضافہ کا امکان ہوگا۔اس طرح جو قوانین واحکام، قرآنی حکومت کی طرف سے نافذ ہوں گی اسلامی یا شرعی قوانین کہلائیں گے۔حکومت کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا کہ کسی بات کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دے دے۔

ماحصل:

1۔اطاعت صرف خدا کی جائز ہے اور کسی کی نہیں۔

2۔خدا کی اطاعت کا عملی طریق اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔

3۔یہ اطاعت اپنے طور پر نہیں ہوگی اسلامی حکومت کے ذریعے ہو سکے گی۔

4۔اسلامی حکومت وہ ہے جو قرآنی طریق سے وجود میں آئے اور اس کا اعلان کرے کہ اس کا فریضہ قرآنی احکام، قوانین، اقدار اور اصولوں کا نافذ کرنا ہے۔یہ کچھ اُمت کے مشورہ سے ہوگا۔

5۔اسلامی حکومت میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔تمام افراد معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی اور اطاعت صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔

6۔اس میں پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں کوئی تمیز نہیں ہوگی سب افراد یکساں واجب التکریم ہوں گے اور حقوق وفرائض کے اعتبار سے عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

7۔اس میں نہ نظام سرمایہ داری باقی رہے گا نہ تھیا کریسی (مذہبی پیشوائیت)۔

8۔یہ ان افراد کے ہاتھوں وجود میں آئے گی جن کی سیرت، اسوہ نبی اکرم ﷺ کے قالب میں ڈھلی ہوگی۔اس سے یہ سرزمین خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

(ماہنامہ طلوع اسلام، مئی جون 1982)

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 10 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائد اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25-بی گلبرگ 2 لاہور فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

طلوع اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتماب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں' ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت

کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام و قوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہو گی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردو بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تا کہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

فکرِ قرآنی کے لیے پرویزؔ سند نہیں

''میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ از خود قرآنِ کریم پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کریں کہ میری فکر صحیح ہے یا نہیں۔ اسے اچھی طرح سن رکھئے کہ جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں قرآنِ کریم کی بجائے کسی انسان کو سند مان لیا، آپ نے فرقہ بندی کی بنیاد رکھ دی اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔''

غلام احمد پرویز

طلوعِ اسلام اپریل 1960ء